معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے　　فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ　ہوائی ڈاک　پندرہ پونڈ　یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک　　پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

• کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۲ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۹۳ء عدد ۶

مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

شذرات

اس سال دسمبر کا مہینہ مسلمانوں کے لیے ماہِ محرم بن کر آیا ہے، گذشتہ برس ۶؍دسمبر کو ان کی مجبوری وبیکسی کا فائدہ اٹھا کر حکومت واقتدار کے نشہ میں دُھت لوگوں نے ان کی قدیم تاریخی بابری مسجد کو شہید کر دیا تھا اور جب اس پر بھی انہیں تسکین نہیں ہوئی تو انھوں نے مسلمانوں کے لہو سے اپنی تشنگی بجھانے کے لیے ان کا قتل عام شروع کر دیا، امن وآشتی اور اہنسا کی یہ سرزمین ابھی تک مسلمانوں کے خونِ ناحق کے چھینٹوں سے رنگین ہے، ظالموں اور سفاکوں نے بابری مسجد کو شہید کر کے ملک کی شہرت وعزت میں بٹّہ لگایا اور اپنی وحشت ودرندگی سے ساری دنیا میں ہندوستان کو ذلیل ورسوا کیا، جس پر وہ بے شرمی اور ڈھٹائی سے فخر وگھمنڈ کر رہے ہیں اور اپنی بہیمانہ حرکت کو بہادری سمجھ رہے ہیں، ایک طرف پوری دنیا میں اس بزدلانہ اور گھناؤنے کام کی مذمت ہو رہی ہے، دوسری طرف آئین وقانون سے اپنے کو بالاتر سمجھنے اور جمہوریت وسیکولرزم کے پرخچے اڑانے والا یہ چھوٹا سا گروہ اسے اپنا شاندار کارنامہ سمجھ کر اترا رہا ہے۔

ع خلقے بمنت یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف

گریہ وزاری کی ایک حد ہوتی ہے، نوحہ وماتم زندہ اور بیدار قوموں کا شیوہ نہیں ہے بلکہ حوادث اور ٹھوکریں ان کے لیے تازیانہ عبرت ہوتی ہیں ؎

لذت شناسِ غم کو ہے اظہارِ غم حرام
روتا ہوں اور دامنِ مژگاں بھی تر نہیں

بابری مسجد کا سانحہ چاہے کتنا ہی دردناک کیوں نہ ہو لیکن یہ غیر محدود نالہ وشیون اور کسی غمِ محرم کی دعوت نہیں ہے بلکہ اس میں مسلمانوں کے لیے یہ درس وپیام مضمر ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں اور خرابیوں کی اصلاح کریں، اپنے حالات ومعاملات کو درست کریں، اپنی دینی واخلاقی زندگی کو سنواریں، اپنا انتشار اور پراگندگی دور کریں اور وہ رویہ اختیار کریں جو خدا کو پسند ہو تاکہ وہ اس کی رحمت ونصرت کے سزاوار ہوں، انکا ایمان وعقیدہ تو یہ ہے کہ یہ پوری کائنات خدا کے

حکم اور اس کی قدرت سے قائم ہے، اس کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے، وہ نہ عدل وقسط کے نظام کی پامالی وبربادی کو گوارا کر سکتا ہے اور نہ نظام عدل وقسط کے دشمنوں کو برپا ہونے دے سکتا ہے۔

حالات کو سنگین بنانے اور بابری مسجد کے مسئلے کو الجھانے کی ذمہ داری خود مسلمانوں پر بھی عائد ہوتی ہے، انھوں نے اس کے نام پر اپنی قیادت کی دوکان چمکائی اور ہندوتوا کا احیا کیا جس کے نتیجہ میں بابری مسجد شہید کر دی گئی اور وہ کچھ نہ کر سکے، اب اگر مسلمانوں کے شور وشغب سے ٹھنڈی فضا گرم اور مسموم ہوئی اور ان کے لیڈروں کی بے سود تقریروں اور اشتعال انگیز نعروں سے ان میں خواہ مخواہ کا جوش واشتعال پیدا ہوا تو ان کے مخالفوں کو پھر کھل کھیلنے کا موقع ملے گا اور وہ تشدد، فرقہ پرستی اور نفرت وعناد کا وہ طوفان برپا کریں گے جو مسلمانوں کی مزید تباہی وبربادی کا موجب ہوگا، یہ وقت بڑے صبر وضبط اور آزمائش کا ہے، اس میں پوری ہوشمندی اور بیدار مغزی سے کام لینے کی ضرورت ہے، جو لوگ مسجد کا تحفظ نہیں کر سکے، انہیں اس کی شہادت کی یادگار اور برسی منانے کا کیا حق ہے۔ آخر ان کی بے تدبیری سے سادہ لوح مسلمانوں کا خون خرابہ کب تک ہوگا۔

اللہ تعالیٰ خیرِ مطلق ہے، وہ شر اور فساد فی الارض کو پسند نہیں کرتا، اس نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، اسلیئے اسے ایک خاص اور محدود دائرے میں آزادی واختیار بھی بخشا ہے لیکن جب انسان خدا کی دی ہوئی اس نعمت کا غلط استعمال کرتا ہے تو دنیا شر وفساد سے معمور ہو جاتی ہے، اتر پردیش میں کچھ لوگوں کو حکومت کیا ملی کہ انھوں نے ملک کو تہ وبالا کر دیا، جمہوریت اور سیکولرزم کی بنیادیں ہلا دیں، اللہ کے بندوں پر مظالم ڈھائے، مساجد ومعابد مسمار کیئے نصاب تعلیم تبدیل کیا، تاریخ بدل دی، ملک کے دستور وآئین کا مذاق اڑایا، قانون کی بالاتری ختم کر دی، عدالتوں کی توہین کی اور ۶؍دسمبر ۹۲ء کو اجودھیا میں بڑے پیمانے پر ہندوتوا شکتی کا مظاہرہ کر کے بابری مسجد کی جگہ مندر بنانے کی تمام رکاوٹیں دور کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن اللہ کی مشیت ومرضی کے سامنے انکی کچھ نہ چلی اور بابری مسجد ڈھانے والوں کو عبرتناک سزا مل کر رہی،

اور دسمبر کے پہلے ہی اترپردیش اور بعض دوسری ریاستوں کو انکے پنجۂ استبداد سے چھٹکارا مل گیا، قرآن مجید میں ہے کہ "اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض سے دفع نہ کرے تو صومعے، گرجے، عبادت خانے اور وہ مسجدیں جن میں اللہ کا بکثرت ذکر ہوتا ہے ڈھا دی جائیں" (حج۔ ۴۰)

اترپردیش کے نئے وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو کی سیکولر پسندی اور مظلوم اور کمزور طبقوں سے ہمدردی اور دلچسپی کی شہرت ہے، انہیں موقع ملا تو وہ ایک صاف ستھری حکومت قائم کرکے اپنی نیک نامی میں اضافہ کریں گے، اب بابری مسجد کا مسئلہ مرکزی حکومت کے دائرہ اختیار میں چلا گیا ہے جس کی گومگو پالیسی نے اسے اور خود کانگریس کی تصویر کو بگاڑا ہے، اس نے مسجد ڈھائے جانے کے بعد اس کی اور اس سے ملحق آراضی کو بحق سرکار ضبط کرکے مسجد و مندر بنانے کے لیے مذہبی لوگوں کے دو ٹرسٹ بنانے کا اعلان کیا ہے اور مسجد و مندر کی جگہوں کے تعین کے لیے سپریم کورٹ کی رائے طلب کی ہے، لیکن اس طرح نہ یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے اور نہ فریقین اس پر راضی ہوسکتے ہیں، اب مسلمانوں کو سیکولر جماعتوں کی تائید و حمایت سے مرکزی حکومت کو آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ سپریم کورٹ سے اپنا ریفرنس زیر دفعہ ۱۴۳ واپس لے کر دستور کی دفعہ ۱۳۸ کے تحت یہ مقدمہ سپریم کورٹ کو فیصلے کے لیے بھیج دے اور عدالت کا جو بھی فیصلہ ہو اس کی پابندی کی جائے، آئینی و قانونی جدوجہد کے بجائے پرانے زخموں کو کریدنا مسئلے کو مزید خراب کرنا ہے۔

نصف صدی سے اترپردیش میں اردو کی حق تلفی کا سلسلہ جاری ہے، ہم کو نئے وزیر اعلیٰ کی انصاف پسندی سے توقع ہے کہ وہ اردو کے معاملے میں بے تعصبی اور فراخ دلی سے کام لے کر اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی تلافی کریں گے اور اسے پھلنے پھولنے کی آئینی و قانونی ضمانت دیں گے، اس سلسلہ میں اردو کو دوسری زبان بنائے جانے کے علاوہ آٹھویں درجے تک اس کی تعلیم کا بندوبست بھی ضروری ہے۔

مقالات

شیخ محمد غوث گوالیاری

از مولانا یوسف متالا۔ لندن

"مولانا یوسف متالا صاحب دارالمصنفین اور معارف کے بڑے قدرداں ہیں وہ گجرات کے علماء و مشائخ اور ادباء و شعراء پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس کے کچھ حصے انھوں نے ازراہ عنایت معارف کے لیے بھیج دیے ہیں اس سلسلے کے بعض مضامین پہلے چھپے تھے اور بعض آئندہ بھی شایع ہوں گے، زیر نظر مقالہ کی ترتیب کچھ بدل دی گئی ہے اور بعض جگہ حوالوں کی تصحیح بھی کی گئی ہے ممکن ہے اب بھی بعض حوالوں کی تصحیح رہ گئی ہو۔" "ض"

شیخ محمد بن خطیر الدین بن عبد اللطیف بن معین الدین بن خطیر الدین بن ابو زید بن شیخ فرید الدین عطار شطاری گوالیاری مشہور بہ شیخ محمد غوث[1] کی عمر جب بارہ سال کی ہوئی تو طلب خدا میں سرگرداں پھرتے ہوئے جونپور تشریف لائے اور قاضی صدر جہاں کے مکان پر قیام کیا قیام کے دوران تحصیل علم میں مصروف رہے، کافیہ وغیرہ تک عبور حاصل کیا پھر اسی کو کافی سمجھ کر علم باطنی کی تلاش میں مصروف ہو گئے، شیخ ابو الفتح ہدایت اللہ سرمست کی خدمت میں فیض روحانی حاصل کیا پھر ان ہی کی ہدایت پر حاجی حمید الدین حضور کی خدمت میں گئے موصوف نے انہیں سلسلۂ شطاریہ میں بیعت فرمایا، ان کے ساتھ ان کے برادر بزرگ شیخ

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۹۳۔

پھول[1] (م ۹۴۵ھ) بھی تھے، حاجی حمید الدین حضور نے ان دونوں بھائیوں کو اپنی فرزندی میں لیا اور تعلیم و تلقین کے بعد شیخ کو اپنے ہمراہ لے کر صوبہ بہار کی طرف روانہ ہوگئے اور شیخ محمد غوث کو مزید فیضان کے لیے کوہستان چنار میں ریاضت کے لیے چھوڑ دیا، شیخ محمد غوث تیرہ ۱۳ سال چند مہینے عبادت و ریاضت میں رہے، درختوں کے پتے کھا کر یاد الٰہی کی (منتخب التواریخ ج ۳ ص ۴) اس کے بعد جب حاجی حمید الدین حضور واپس ہوئے تو مرید کو بامراد پایا، اسی عرصہ میں اپنی مشہور تصنیف "جواہر خمسہ" لکھی، حاجی حمید الدین حضور نے تمام منازل سلوک طے کرائے اور خرقۂ خلافت عطا کیا۔

مولانا محمد حسن غوثی نے گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ محمد غوث روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے انھوں نے جس کو قبول کر لیا اس کے سر کی اور دل کی آنکھوں کو مشاہدہ اور معائنہ کا نور حاصل ہوگیا اور اس میں حقیقت بینی کی قوت آگئی[2]، صاحب خزینۃ الاصفیا لکھتے ہیں کہ وہ چودہ سلسلہائے تصوف کے معتقد تھے (ج ۲ ص ۳۳ مطبع ثمر ہند لکھنؤ ۱۸۷۳ء)۔

شاہ محمد غوث گوالیاری نے اپنے شیخ طریقت حاجی حمید الدین حضور[3]

---

[1] معارف: مقالہ نگار نے یہاں شاہ محمد غوث کے برادر بزرگ کا نام پھول لکھا ہے اور آگے چل کر بہلول لکھا ہے، ان کا ماخذ غالباً پروفیسر محمد مسعود احمد حیدرآباد سندھ کا وہ مقالہ ہے جو معارف جولائی تا ستمبر ۱۹۶۳ء میں شایع ہوا ہے ان میں بھی ان کا نام شیخ پھول ہی لکھا ہے لیکن ان کے مراجع منتخب التواریخ بدایونی (ج ۳ ص ۴) اور خزینۃ الاصفیا مفتی غلام سرور (ج ۲ ص ۴۳۳) میں بہلول لکھا ہے اس لیے پھول یقیناً غلط ہے اور غالباً یہ کاتب کی غلطی ہوگی، تعجب ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے اس کی تصحیح کیوں نہیں کی [2] اذکار ابرار ص ۲۸۹ [3]

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۷ پر)

(متوفی ۹۳۰ھ/۱۵۲۳ء) سے مستقل قیام کے لیے استفسار کیا تو موصوف نے فرمایا، کُل جہاں تمہارا ہے جہاں مزاج چاہے رہو، اس میں تم کو اختیار دیا گیا ہے لیکن چونکہ زمانہ ریاضت ہی میں قلعۂ گوالیار میں قیام کا اشارہ ہوگیا تھا اس لیے وہ گوالیار تشریف لائے اور یہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا صاحب مناقب غوثیہ لکھتے ہیں:

"الغرض جب حضرت غوث اللہ ...... رخصت ہوکر گوالیار پہونچے اور وہاں اقامت کی تو بانگ درویشی و صدائے عظمت و ولایت مورثی عالم میں پھیلی، عالم

(بقیہ ص ۴۰۶ حاشیہ) یہ شاہ قاذن سرقاضن کے مرید تھے جن کے پیر و مرشد شیخ عبداللہ شطاری تھے، انھوں نے خوب سیاحت کی، اپنے ساتھ صراحی کے برابر ایک لوٹا رکھتے تھے ہاتھ میں عصا کندھے پر جانماز ڈال کر پھرتے تھے اور جسمانی اعتبار سے بہت کمزور تھے، شیخ محمد جی کا لقب غوث تھا اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر آپ سے بیعت ہوئے کہتے ہیں کہ جب شیخ محمد غوث بیعت ہونے کے لیے آئے تو یہ اٹھ کر ان سے بغلگیر ہوئے اور فرمایا غوث! آ جاؤ۔ جب حاضرین نے دریافت کیا کہ بغیر کسی کمال کے آپ نے انہیں غوث کیوں کہا تو جواب میں فرمایا اس میں کیا حرج ہے باپ اپنے بیٹے کا نام شاہ عالم رکھتا ہے وہ حقیقتاً شاہ قاذن سرقاضن کے خلیفہ تھے لیکن یہ دیکھکر کہ انکی طرف رجحان کی وجہ سے مرشد کے صاحبزادہ شیخ ابوالفتح کو تکلیف ہوتی ہے وہ ان کے پاس پہنچ گئے اور ان سے مرید ہوکر خلافت حاصل کی، شیخ محمد غوث اپنے شجرۂ ارادت میں شیخ ابوالفتح کا نام نہیں لکھتے تھے جس سے ان کو سخت تکلیف ہوتی تھی، نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ بھی شیخ حاجی حمید کا معتقد ہوگیا تھا ۹۶۸ھ/۱۵۶۰ء میں ان کی وفات ہوئی، مزار گوالیار میں ہے، ان کی کتاب معراج نامہ بہت مشہور ہے جس میں علمائے گجرات کے انکار کے قصے درج ہیں اور حقیقت حال اللہ ہی زیادہ جانتا ہے، (ماخوذ از اخبار الاخیار ص ۱۵۴ و خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۳۳۳)

دعا میاں ملوک وسلاطین وقت مطیع ومنقاد ہوئے مگر ان کا یہ حال تھا کہ کوئی شخص
مجلس عالی میں دنیا کا نام نہ لے سکتا تھا، گوالیار میں کچھ عرصہ قیام کیا تھا کہ مرض
خیارک میں مبتلا ہوگئے اور چھ مہینے تک صاحب فراش رہے۔[1]

صحتیاب ہونے کے بعد قاضی رکن الدین اور قاضی خدا بخش کو حاجی حمید الدین کی
خدمت میں روانہ کیا جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو حاجی حمید الدین بہت مسرور ہوئے اور
اسی وقت جبہ و دستار طلب کر کے اپنے دست مبارک سے دونوں حضرات کے سپرد
کیا اور اپنی جانب سے شاہ محمد غوث (متوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء) کے نام ایک فرمان لکھوا کر دستخط
فرما کر قاضی رکن الدین کے حوالے کیا، صاحب مناقب غوثیہ نے فرمان مذکورہ کا یہ
مضمون لکھا ہے :-

"مجمع فی الدنیا والآخرہ بندگی حضرت شیخ المشائخ میاں محمد غوث متع اللہ المسلمین
بطول بقائہ از ظہور شمس انصاری المقدسی مطالعہ فرمانید تمام احوال قابل شکر ہیں،
"قل الحمد للہ دائما" معلوم وروشن ہو کہ اس درویش کو بھی بیس[20] رمضان سے
ران کا درد ہوا تھا اور جو کچھ حال واحوال اور اقوال اس فقیر کا ظاہر و باطن تھا
آں فرزند کو سونپ کر اپنا قائم مقام کیا بلکہ قالب کا حکم بھی تم شیخ المشائخ کے ہاتھ
میں دیا چنانچہ اپنی موجودگی میں صندوق تیار کرا کر حاضران مجلس کو (تمہارے)
آدمیوں کی موجودگی میں نصیحت کر دی ہے کہ ہم کو امانت رکھو قالب کا اختیار
بھی فرزندم میاں غوث کو دیا۔ جس جگہ وہ قابل سمجھیں لے جائیں دوسرے یہ
کہ آں فرزند کو اپنا قائم مقام کر کے جملہ خلفاء و مریدین کو حوالہ کیا جس کو آں فرزند

---

[1] مناقب غوثیہ اردو ص ۵۲ بحوالہ معارف ج ۹۰ عدد ۲ ص ۱۱۰۔

قبول کرے مقبول، اور جس کو مردود کرے مردود۔ اور جبہ و دستار اپنے حضور
تمہارے آدمیوں کے سپرد کر دیا یقین کر لو کہ جو کچھ رنج ومشقت اس فقیر نے اٹھایا
اور درگاہ حق میں توکل پر ثابت رہا وہ سب آں فرزند کے واسطے تھا، یہ فقیر
درخت کے سایہ میں مرقد کرے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ اور جو اس فقیر کے سفر کے بعد
ہوگا وہ شیخ سکندر کی کتابت سے معلوم ہوگا۔ (مناقب غوثیہ اردو ص ۵۳-۵۴)۔

حاجی حمید الدین حضور کی وفات کے بعد شیخ سکندر نے جو مکتوب شاہ محمد غوث
کے نام ارسال کیا تھا اور اس میں جو چشم دید واقعات بیان کیے تھے اس کو پڑھ کر معلوم
ہوتا ہے کہ حاجی حمید الدین نے اپنی وفات کے بارہ میں جو کچھ فرمایا تھا حرف بحرف
ثابت ہوا، مکتوب مذکور کے آخر میں شیخ سکندر تحریر فرماتے ہیں :

" اکیس[21] ذی الحجہ کو ایک پاس شب باقی تھی کہ یکایک فرمایا " یارو اٹھو رحمت
کا وقت ہے، اس درویش کو پیر حکم ہوتا ہے کہ آج جو تمہارا روز ہے کہ تمام انبیاء و اولیاً
تمہاری ملاقات کے منتظر ہیں شتاب آؤ"۔ اور اس وقت چوڈول پر سوار ہو کر
باہر آئے اور اپنے حضور میں قبر درست کرائی بعدہ اس چوڈول درخت کے سایے
کے نیچے لائے جو کوئی اپنا حال عرض کرتا فرماتے فرزندم میاں محمد غوث کے حوالہ
کیا، یہاں تک کہ صبح صادق چمکی اور آپ سر سے پاتک چادر اوڑھ کر شغل مع اللہ
کے ساتھ دار الفنا سے دار البقا کو رحلت فرما گئے۔ دیگر معروض کہ اس خاکروب
آستانہ کو خاک روبی آستانہ کی خدمت پر نواز کر جامۂ خلافت عطا فرمایا ہے
لیکن ثابت جب ہی ہو سکے گا جب آنحضرت قبول فرمائیں گے"۔ (مناقب غوثیہ
اردو، ص ۵۵ بحوالہ معارف ج ۹۰ عدد ۲۔

غرض حاجی حمید الدین حضور کی وفات کے بعد شاہ محمد غوث گوالیاری مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور گوالیار میں قیام کر کے دور و نزدیک فیض رسانی کا سلسلہ شروع ہوا۔

خواجہ خانوں

شاہ محمد غوث گوالیاری کے زمانے میں گوالیار میں ایک اور بزرگ بھی قیام پذیر تھے جن کو خواجہ خانوں کے نام سے یاد کیا جاتا تھا صاحب فیضان ولایت کی ایک تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ خانوں اور شاہ محمد غوث زندگی میں نہیں مل سکے، موصوف نے لکھا ہے:

> "۹۴۰ھ میں مورخہ یکم جمادی الاول کو انھوں نے اپنے بڑے فرزند حضرت خواجہ بندگی احمد قدس اللہ سرہم سے ارشاد فرمایا کہ میں اب تم سے رخصت ہوتا ہوں بعد وفات میری تجہیز و تکفین حضرت محمد غوث گوالیاری کریں گے میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ملاقات ان کی ہماری اس وقت پر منحصر ہے۔"[1]

آخری جملے سے ظاہر ہے کہ زندگی میں دونوں بزرگوں کی ملاقات نہیں ہوئی اور خواجہ خانوں کے وصال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق شاہ محمد غوث گوالیاری تشریف لائے اور خواجہ مرحوم کے صاحبزادگان کے ساتھ غسل دیا، تجہیز و تکفین فرمائی اس کے بعد نماز جنازہ بھی پڑھائی ۹۴۰ھ دوم جمادی الاول وقت چاشت تدفین سے فارغ ہوئے[2]۔

شیخ غوث نے طریقہ شطاریہ میں حاجی معمر حمید بن ظہیر شطاری کی خدمت میں برسوں باریاب رہ کر تربیت حاصل کی اور منصب مشیخت پر فائز ہوئے، بابر اور ہمایوں کو ان سے بہت اعتقاد تھا، شیر شاہ سوری نے تخت سنبھالنے کے بعد ہمایوں کے مصاحبوں کو قتل کرنے کا حکم دیا ان میں شیخ محمد غوث بھی تھے، شیخ غوث کو جب اسکا

[1و2] معارف ج ۹۰ عدد ۲ ص ۱۱۷ بحوالہ فیضان ولایت ص ۱۸۔

علم ہوا تو آپ گجرات روانہ ہوگئے اور احمد آباد پہونچکر سارنگ پور نامی علاقہ میں رہنے لگے[1] شیخ کا قیام گجرات میں اٹھارہ[18] سال رہا اس مدت میں کچھ وقت چانپا نیر اور کچھ بھروچ میں بھی گذرا۔

شیخ کی تکفیر کا واقعہ

گجرات آکر ایک رسالہ "معراجیہ" لکھا جس میں اپنی معراج کا ذکر کیا۔ جس کی بنیاد پر بہت سے علما ان کے مخالف ہوگئے، جن میں شیخ علی متقی پیش پیش تھے ان علما نے ان کے کفر کا فتویٰ دیا، یہ سلطان محمود گجراتی کا زمانہ تھا محمود نے گجرات کے بڑے عالم شیخ وجیہ الدین علوی سے اس فتوے کے سلسلے میں رائے معلوم کی، شیخ وجیہ الدین شیخ غوث الدین کی روحانیت سے پہلے[2] ہی متاثر ہو چکے تھے اور ان کے مرید ہو گئے تھے چنانچہ جب سلطان محمود شیخ وجیہ الدین کی خدمت میں شیخ علی متقی کے فتوے کو لے کر حاضر ہوئے تو شیخ وجیہ الدین نے فتویٰ پڑھ کر پھاڑ دیا اور فرمایا کہ معراج نامہ میں جتنے واقعات درج کئے گئے ہیں وہ تو عالم خواب کے واقعات ہیں اور وہ لغو اور بے بنیاد ہیں عام لوگ انکا درجہ کیا جانیں وہ ایسے بڑے درویش ہیں کہ ان تک رسائی مشکل ہے وہ صاحبِ نسبت اور صاحبِ کشف و کرامات ہیں ان کا شمار اہل حال اور اہل قال میں ہے۔

شیخ وجیہ الدین نے نہ صرف فتویٰ کی مخالفت کی بلکہ ایک رسالہ لکھ کر فقہی کتابوں

---

[1] تاریخ صوفیائے گجرات [2] **معارف**: ملا عبدالقادر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ وجیہ الدین شیخ متقی کے فتویٰ کی وجہ سے پہلی دفعہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور انکو دیکھکر ایسا متاثر ہوئے کہ فتویٰ چاک کر دیا (منتخب التواریخ ج ۳ ص ۴۴) اس لیے مقالہ نگار کا یہ بیان کہ "شیخ وجیہ الدین شیخ غوث کی روحانیت سے پہلے ہی سے متاثر تھے" لغزش قلم کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

سے مسئلہ تکفیر پر روشنی ڈالی پھر صوفیائے کرام کے احوال سے بحث کی کہ حالت سکر میں جو کچھ کہہ جاتے ہیں وہ قابل مواخذہ نہیں، شیخ وجیہ الدین فرماتے تھے کہ کسی شخص کی ننانوے باتوں میں سے ایک بات بھی اسلام کی ہو تو اس کو مومن سمجھو اور کسی کلمہ گو اہل قبلہ کو کافر نہ کہو۔[1]

اس کے باوجود محققین کی رائے یہ ہے کہ شیخ محمد غوث گوالیاری کے افکار و معتقدات میں اور خصوصاً روحانی مجاہدات میں انکا واسطہ جوگیوں سے پڑا، ان کی کتاب جواہر خمسہ کے متعلق مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ :-

"اس کی بنیاد زیادہ تر بزرگوں کے احوال اور اپنے تجربات پر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح احادیث سے ثابت ہونے یا معتبر کتب شمائل و سیر سے اخذ کرنے کو ضروری نہیں سمجھا گیا اس میں نماز احزاب صلوٰۃ العاشقین، نماز تنویر القبر اور مختلف مہینوں کی مخصوص نمازیں اور دعائیں ہیں جن کا حدیث و سنت سے کوئی ثبوت نہیں" جوہر دوم" میں اسمائے اکبریہ خاص شیخ کے جمع کیے ہوئے ہیں جن میں فرشتوں کے عبرانی و سریانی نام ہیں اور حرف ندا سے ان کو خطاب کیا گیا ہے جس سے استعانت بغیر اللہ کا شبہہ ہوتا ہے ایک دعائے تشیخ بھی آتی ہے جس میں عبرانی و سریانی اسماء حرف ندا کے ساتھ ہیں ساری کتاب کی بنیاد دعوت اسماء پر ہے ان اسماء کے موکل مانے گئے ہیں جو اس کی اصل ماہیت سے واقف ہیں حروف تہجی اور ان کے

---

[1] معارف :- مقالہ نگار نے یہاں تاریخ دعوت و عزیمت حصہ چہارم کا حوالہ دیا ہے دوسری کتابوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے لیکن انھوں نے جو تفصیل لکھی ہے اس کے بعض حصوں کا ذکر تاریخ دعوت و عزیمت اور دوسرے مراجع میں نہیں ہے۔

موکلوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔[1]

مریدین | شیخ محمد غوث کے سلسلۂ شطاریہ میں منسلک ہونے والوں میں علامہ وجیہ الدین کے علاوہ شیخ صدر الدین ذاکر، شیخ لشکر محمد، شیخ ولی محمد، شیخ علی شیر اور شیخ صبغۃ اللہ بھروچی جیسی عظیم شخصیات بھی ہیں جنھوں نے گجرات اور دکن میں اس سلسلہ کو خوب پھیلایا بلکہ شیخ صبغۃ اللہ تو اس سلسلہ کو لے کر مدینہ منورہ پہونچے اور بڑے بڑے مشائخ مدینہ نے ان سے اس کو حاصل کیا۔[2]

خلفاء | ذیل میں حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کے خلفائے کرام اور ان کے وطن کا نام درج کیا جاتا ہے۔

نام	وطن	نام	وطن
۱۔ شیخ عبد اللہ بن محمد غوث گوالیاری	گوالیار	۱۰۔ شیخ محمد شمس ذاکر	بڑودہ
۲۔ شیخ مبارک	"	۱۱۔ حبیب شطاری	"
۳۔ شیخ بدیع الزماں سمرقندی	"	۱۲۔ شیخ محمد اویس بن شاہ محمد غوث گوالیاری	احمد آباد
۴۔ شیخ نور الدین ضیاء اللہ بن شاہ محمد غوث	اکبر آباد	۱۳۔ شیخ اسمٰعیل " "	"
۵۔ شیخ عبد اللہ صوفی	"	۱۴۔ محمد عاشق	سنبھل
۶۔ شیخ اکمل الدین برہان	برہانپور	۱۵۔ مولانا عبد الفتاح ناگوری	اجمیر
۷۔ شیخ لشکر محمد عارف	"	۱۶۔ شیخ محمد جمالی	سرہند
۸۔ شیخ سراج محمد بنیانی	"	۱۷۔ شیخ جلال واصل	کالپی
۹۔ شیخ صدر الدین	بڑودہ	۱۸۔ شیخ جیوہ عبد الحی	بدولی

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت حصۂ چہارم ص ۲۴۴ - ۲۴۵ [2] تاریخ گجرات، تاریخ صوفیائے گجرات بحوالہ سفینۃ الاولیاء۔

۱۹۔ شیخ شمس الدین شیرازی — بیجاپور

۲۰۔ شیخ احمد متوکل — (اجین)، مالوہ

۲۱۔ شیخ عالم — "

۲۲۔ شیخ منجھن — سارنگ پور

۲۳۔ شیخ عمر — سارنگ پور

۲۴، ۲۵۔ شیخ وجیہہ الدین علوی اور شیخ علی شیر بنگالی اعاظم خلفاء میں سے تھے[۱]

شطاری سلسلہ حضرت شیخ بایزید بسطامی کی طرف منسوب ہے[۲]۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سلوک و تصوف میں دوسرے سلسلوں کے بزرگوں کے مقابلہ میں اس سلسلہ کے بزرگ زیادہ تیز اور سرگرم (شطار) ہوتے ہیں۔ یہ حضرات جنگلوں میں رہ کر سخت ریاضتیں کرتے تھے، ان کی طرف غیر معمولی افعال و تصرفات منسوب کیے جاتے تھے[۳]۔

۹۶۳ھ میں شیخ محمد غوث گوالیار تشریف لے گئے یہاں کچھ مدت قیام کے بعد اکبر کے زمانے میں آگرہ آئے مگر یہاں بھی علماء نے آپ کی مخالفت کی آخر آزردہ دل ہوکر واپس گوالیار تشریف لے گئے۔

تصانیف | رسالہ معراجیہ کے علاوہ ان سے جواہر خمسہ، کلید مخازن، ضمائر و بصائر، کنز الوحدۃ، بحر الحیوۃ بھی یادگار ہیں۔

کنز الوحدۃ میں تحریر فرماتے ہیں کہ اہل ذوق کے نزدیک ایمان کی پانچ قسمیں ہیں، اول تکلیفی۔ یہ سب قسموں سے عام ہے اور کافر و مومن سب کو شامل ہے۔ دوم تقلیدی جو عام ہے اور ہر مومن میں پائی جائے گی چاہے وہ مقلد ہو یا محقق ہو۔ سوم استدلالی یہ قسم خاص ہے جو علمائے مومنین میں پائی جائے گی۔ چہارم حقیقی یہ اخص ہے اور یہ صرف

۱؎ گلزار ابرار۔ معارف فروری ۱۹۸۲ء ص ۱۱۳ ۲؎ منتخب التواریخ ج ۳ ص ۴ ۳؎ رود کوثر ص ۳۸۰، نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۹۵۔

اولیاء میں پائی جاتی ہے، پنجم عینی یہ قسم اس شخص میں پائی جاتی ہے جو ولایت محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہو اور اپنی آنکھوں سے احدیت مطلقہ کو دیکھتا ہو۔

دربار مغلیہ سے تعلق | مغلیہ دربار سے بھی شیخ غوث گوالیاری کے گہرے تعلقات رہے، تزک بابری میں ۹۳۶ھ / ۱۵۲۹ء کے واقعات میں لکھا ہے کہ:

"محرم کی تیسری کو گوالیار سے شہاب الدین خسرو کے ساتھ شیخ محمد معظم گوالیری رحیم داد کی سفارش کرنے آئے، شیخ ممدوح ایک درویش و معظم آدمی ہیں ان کے فرمانے سے رحیم داد کی خطا معاف کر دی گئی[۱]"

جلال الدین محمد اکبر بھی اپنے والد نصیر الدین محمد ہمایوں اور دادا ظہیر الدین محمد بابر کی طرح شاہ محمد غوث سے خاص ربط خاطر رکھتا تھا چنانچہ جب شاہ محمد غوث اکبرآباد تشریف لائے اور بیرم خاں و شیخ گدائی کے ناروا سلوک سے خاطر برداشتہ ہوکر واپس گوالیار گئے تو اکبر بادشاہ بیرم خاں سے آزردہ ہوگیا اس ربط خاص کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بیرم خاں کی شہادت کے بعد وہ پھر اکبرآباد تشریف لے آئے اور یہیں انتقال فرمایا اور گوالیار میں دفن کیے گئے[۲]۔

نور الدین جہانگیر بادشاہ بھی شاہ محمد غوث گوالیاری کے علوئے مرتبت کا قائل تھا، بارہویں جشن نوروز کے ذیل میں جو حالات لکھے ہیں اس میں شیخ وجیہہ الدین علوی گجراتی (م ۹۹۷ھ / ۱۵۸۸ء) کے روضہ کی زیارت کے تاثرات کے ضمن میں شاہ محمد غوث گوالیاری کا بھی ذکر آگیا ہے کہ:

۱؎ بحوالہ ظہیر الدین محمد بابر مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں ص ۴۳۹ ۲؎ معارف ج ۹۰ عدد ۲ ص ۱۲۳۔

"شیخ وجیہ الدین شیخ محمد غوث گوالیاری کے ایسے بلند مرتبہ خلیفہ تھے جن پر خود مرشد کو فخر ہوتا ہے اور جن کی ارادت خود شیخ محمد غوث کی بزرگی پر دلیل ہے۔"

شیخ غوث کے ایک بھائی بہلول بھی صاحب ارشاد و کرامت بزرگ تھے، ہمایوں کو ان سے عقیدت تھی مگر مرزا ہنڈال نے ان کو شہید کر دیا تھا۔ جہانگیر نے توزک میں لکھا ہے کہ وہ اہل محل کے ساتھ بیانہ کا قلعہ دیکھنے گئے شہنشاہ ہمایوں کے بخشی محمد نے جو انکے عہد حکومت میں اس قلعے کے قلعدار تھے وہاں صحرا کے رخ پر ایک عمارت تعمیر کی ہے جو نہایت بلند اور ہوادار ہے شیخ بہلول کا مزار بھی اس کے متصل ہے اور یہ مزار فیض و برکت سے خالی نہیں ہے۔ شیخ بہلول شیخ محمد غوث کے بڑے بھائی تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کے مختلف ناموں کے مختلف اثرات کے علم میں مہارت حاصل تھی، شہنشاہ ہمایوں ان سے نہایت درجے کا ربط خاطر اور انتہائی عقیدت رکھتے تھے۔

جس زمانے میں ہمایوں نے بنگال کو فتح کر کے کچھ عرصہ وہاں قیام کیا تھا اسوقت ہندال مرزا شاہی حکم کے مطابق آگرے میں مقیم تھا اس نے بغاوت کا جھنڈا بلند کرتے ہوئے اپنے نام کا خطبہ جاری کیا جس کی اطلاع مختلف لوگوں کی عرضداشتوں کے ذریعہ شہنشاہ کو ملی اس نے اسے سمجھانے اور نصیحت کرنے کے لیے شیخ بہلول کو بھیجا تاکہ وہ اس کے باطل ارادے کو دور کر کے اسے خلوص و اتفاق کی شاہراہ پر لے آئیں چونکہ بدخواہ فسادیوں نے مرزا پر سلطنت کا افسوں پڑھ کر پھونکا تھا اس لیے وہ اپنے باطل ارادوں سے دستبردار ہونے پر راضی اور دوبارہ اطاعت اختیار کرنے کی طرف راغب نہ ہوا بلکہ فسادیوں کی انگیخت پر شیخ بہلول کو چار باغ میں جو فردوس مکانی شہنشاہ بابر نے

---

[1] تزک جہانگیری اردو لاہور ج ا ص ۴۰۶۔

دریائے جمنا کے کنارے تعمیر کرایا ہے انہیں تہ تیغ کر دیا۔

محمد بخشی کو چونکہ شیخ سے عقیدت و ارادت تھی اس لیے ان کی میت کو قلعہ بیانہ میں لاکر دفن کر دیا[1]

وفات | شیخ محمد غوث کی وفات ۱۵[2] رمضان ۹۷۰ھ/۱۵۶۳ء میں آگرہ میں ہوئی تھی جہاں سے ان کے جسد خاکی کو گوالیار لے جاکر دفن کیا گیا، یہیں مزار پُر انوار ہے۔

محمد غوث سید قطب عالم — چو در وصل خدا گردید موصول
بتاریخ وصالش گفت سرور — محمد متقی سلطان مقبول[3]

طہارت و نظافت کا خیال | شیخ میاں غوث محمد گوالیاری کو طہارت کا بڑا خیال رہتا تھا پانی کی پاکی میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے اور اس کا برتن نہایت صاف رکھتے تھے ایسی احتیاط کرتے کسی اور کو نہیں دیکھا گیا انہیں غصہ بھی بہت آتا تھا چنانچہ شیخ عبدالوہاب فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ہم شیخ حسین کے ہمراہ میاں غوث سے ملنے گئے انھوں نے ان کے مٹکے سے ایک آبخورے میں پانی لے کر پیا اور پھر اسے زمین پر رکھدیا یہ دیکھکر میاں غوث کو سخت غصہ آیا اور بلند آواز سے کہا ہائے ہائے تم نے آبخورے کو نجس کر دیا انکا اتنا کہنا ہی تھا کہ شیخ حسین نے آبخورہ زمین پر دے مارا اور کہا کہ اگر یہ ناپاک ہوگیا ہے تو اسے توڑ دینا ہی اچھا ہے یہ سُن کر میاں غوث مسکراتے ہوئے شیخ حسین کی طرف بڑھے اور ان کو گلے لگا لیا۔ اس پر حاضرین میں سے کسی کو یہ خیال آیا کہ شیخ حسین نے

---

[1] توزک جہانگیری ص ۵۱۱، [2] معارف: خزینۃ الاصفیاء میں یہی تاریخ درج ہے مگر پروفیسر محمد مسعود احمد نے کئی حوالوں سے ۱۴ رمضان تاریخ وفات لکھی ہے (معارف ج ۹۰ عدد ۲ ص ۹۹ و ۱۱۰)۔ [3] خزینۃ الاصفیاء ص ۳۱۸۔

انگورہ توڑ کر اسراف کیا ہے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ اس شبہہ کو دور کرنے کے لیے شیخ حسین نے فرمایا امام مالکؒ کا مذہب یہ ہے کہ مٹی کا برتن اگر ناپاک ہو جائے، تو اس کو پاک کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے اس کا علاج توڑ دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہے[1]

[1] شیخ حسین مذکور شیخ عبدالوہاب کے دوستوں اور عزیزوں میں سے تھے شیخ عبدالوہاب فرماتے تھے کہ یہ عجیب حالت اور بلند ہمت کے مالک تھے، معمولی چیزیں بھی خریدتے تو ان کے پاس جو کچھ ہوتا وہ سب بیچنے والے کو دیدیتے خواہ وہ مظفری ہوتا یا روپیہ اور کبھی نہ سودا چکاتے اور نہ اسکی قیمت کا حساب کرتے۔

شیخ عبدالوہاب فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ہم دریائے نربدا کو عبور کرنا چاہتے تھے لیکن دریا کے بیچ میں ایک شیر اپنی کچھار میں بیٹھ گیا تھا اس کی وجہ سے لوگ دریا میں آنے جانے سے پرہیز کر رہے تھے اور کنارے پر بڑی بھیڑ ہو گئی تھی یہ دیکھ کر شیخ حسین اپنے ایک ہاتھ میں چاقو لیکر اور دوسرے پر ایک چادر لپیٹ کر کچھار کے اندر گھس گئے اور شیر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے لوگوں کے آنے جانے کا راستہ کھولدیا۔

ایک مرتبہ ایک آدمی اونچی جگہ نماز پڑھانے کے لیے کھڑا ہوا وسوسہ کی وجہ سے اس نے نیت کے الفاظ اتنی بار دہرائے کہ مقتدی پریشان ہو گئے اس پر شیخ حسین نے اس زور سے اس امام کے سینے پر ہاتھ مارا کہ وہ برابر کے پانی میں گر پڑا اور پھر اس کے دل میں کوئی وسوسہ باقی نہیں رہا، ایک مرتبہ ان سے ایک طالب علم احیاء العلوم پڑھ رہا تھا جسکی زبان میں سخت لکنت تھی عبارت پڑھتے وقت وہ عاجز اور مضطرب ہو جاتا تھا، شیخ عبدالوہاب کہتے ہیں کہ اس طالب علم کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے جو شیخ حسین نے اس (بقیہ حاشیہ ص ۴۱۹ پر)

غوثیہ کتبخانہ | حضرت غوث محمد گوالیاری کی اولاد احمد آباد میں آکر آباد ہوئی تو اپنے ساتھ بزرگوں کے بہت سے تبرکات بھی لائی۔ جن میں کتابیں بھی تھیں ان میں ایک بزرگ فضل علی عرف بارک اللہ بڑے صاحب ذوق تھے، ان کے پاس ایک اچھا کتب خانہ بھی تھا جب تک اس خاندان میں علمی ذوق رہا کتب خانہ بھی تھا اس کے بعد برباد ہو گیا[2]

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۸) امام کے دل وساوس دور کرنے کے لیے کیا تھا لیکن میں اس وجہ سے خاموش رہا کہ شاید اس کی ہمت رفتہ رفتہ شیخ حسین کے اثرات قبول کرلے گی (اخبار الاخیار ص ۲۶۲) [2] گجرات کی تمدنی تاریخ ص ۲۴۹۔

بزم صوفیہ

جس میں عہد تیموری سے پہلے کے صوفیائے کرام حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانیؒ، حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فریدالدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت بوعلی قلندر پانی پتیؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، حضرت خواجہ گیسو درازؒ اور حضرت عبدالحق توشہ ردولویؒ کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کیے گئے ہیں، ان بزرگان دین نے اپنے عہد میں مذہب۔ تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا۔ اسکی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمایئے۔ آخری ایڈیشن میں دو مفید ضمیموں (ملفوظات خواجگان چشت، ہندوستان میں وحدت الوجود کے مسئلہ پر ایک نظر) کا اضافہ بھی ہے جس کا مطالعہ تصوف کا مطالعہ کرنیوالوں کیلئے ضروری ہے۔

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن صفحہ ۷۲۳۔ قیمت ۱۱۵ روپیے

بریلی کے اہم اخبارات

از ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، بریلی

(۲)

روزانہ اخبار | مجھے قاضی عاشق حسین عاشق بریلوی (م ۱۹۴۹ء) زمیندار موضع للکن پرگنہ شاہی ضلع بریلی۔ سکنہ صوفی ٹولہ۔ شہر کہنہ بریلی کے یہاں سے ہفتہ وار اڈیشن روزانہ اخبار بریلی کے دو اوراق فراہم ہوئے جن میں ان کا کلام شعر شایع ہوا تھا۔ ان اوراق کی تفصیل مندرجۂ ذیل ہے:

۱۔ شمارہ نمبر ۲۹۔ جلد ۱۱۔ یہ سرورق ہے۔ جگہ بہ جگہ دریدہ۔ ماہ و سالِ اشاعت دریدگی کی نذر ہو گئے۔ ٹائیٹل کے نیچے جو عبارت ملتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ "اخبار روزانہ اخبار ہفتہ وار ایڈیشن ہر انگریزی ماہ میں چار بار ۷، ۱۴، ۲۱، ۲۸ کو شایع ہوتا ہے"۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ روزانہ اخبار کے علاوہ ہفتہ وار ایڈیشن بھی شایع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ جلد نمبر شمارہ نمبر اور معینہ تاریخہائے اشاعت کو سامنے رکھ کر شمار کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شمارے کی تاریخ اشاعت ۲۱ نومبر ۱۹۲۸ء ہونی چاہیے۔ سرورق پر ایڈیٹر کا نام کرم الٰہی کلیم اور مقام اشاعت فراشی اسٹریٹ بریلی ملتا ہے۔

۲۔ شمارہ نمبر ۵۔ جلد نمبر ۲۶۔ مطبوعہ ۷ فروری ۱۹۴۳ء۔ یہ آخری ورق ہے یعنی صفحہ گیارہ ۱۱ اور صفحہ بارہ ۱۲۔ اس سے معلوم ہوا کہ روزانہ اخبار کا ہفتہ وار ایڈیشن بارہ ۱۲ صفحات پر مشتمل تھا۔

۳۔ شمارہ نمبر ۲۹۔ جلد ۲۷۔ مطبوعہ ۷ اگست ۱۹۴۴ء۔ یہ سرورق ہے جس پر انگریزی حروف میں ایک مہر لگی ہے۔ مہر کا مضمون ہے "روزانہ اخبار آفس۔ نینی تال روڈ بریلی یوپی"۔ اس سے معلوم ہوا کہ روزانہ اخبار کا دفتر فراشی اسٹریٹ سے نینی تال روڈ پر منتقل ہو گیا تھا۔

مذکورہ اوراق کے مشمولات اور مزید جستجو کے بعد جو باتیں سامنے آئیں وہ مندرجۂ ذیل ہیں:

روزانہ اخبار اور اس کا ہفتہ وار ایڈیشن بریلی سے ۱۹۱۶ء میں جاری ہوا۔ اس کے مالک اور مدیر کا نام کرم الٰہی کلیم تھا جس کا تعلق پنجابیان کی شمسی برادری سے تھا۔ وہ خوش صورت، خوش لباس، باشرع اور عمر دراز فرد تھا۔ روزانہ اخبار کا پہلا دفتر محلہ فراشی ٹولہ بریلی میں تھا بعد کو روزانہ اخبار کا دفتر محلہ عقب کوتوال نینی تال روڈ بریلی میں اس مکان میں منتقل ہوا جو مشہور صحافی۔ مورخ اور ماہر تعلیم سید الطاف علی بریلوی (م ۱۹۸۵ء) کی ملکیت تھا۔ مکان کے زیریں حصے میں روزانہ اخبار کا دفتر اور پریس تھا۔ کار کتابت کرم الٰہی کلیم کے فرزند مہر الٰہی کے سپرد تھا اور مشین مین کا نام نبی جان شمسی تھا جس کو داستان امیر حمزہ حفظ تھی اور اس حیثیت سے شہرت رکھتا تھا۔ روزانہ اخبار کو منور حسین سکنہ شیش محل محلہ خواجہ قطب بریلی فروخت کرتا تھا۔ اس کی زبان کی طراری اور خبروں کی ڈرامائی طور پر ادائیگی مجمع لگا لیتی تھی۔ اسکا وجہ سے کسی ستم ظریف نے اس کا نام "چناں چہ مرچنٹ" رکھ دیا۔ روزانہ اخبار کی مقبولیت میں "چناں چہ مرچنٹ" کی خدمت اپنی جگہ اہم تھی۔[۱۵]

روزانہ اخبار کے مذکورہ بالا شماروں میں جلد ۱۱ اور جلد ۲۶ کے شماروں کے صفحے کی لمبائی ۳۲½ سینٹی میٹر اور چوڑائی ۲۳½ سینٹی میٹر ہے۔ جلد ۲۷ کے شمارے کی لمبائی ۳۷½ سینٹی میٹر اور چوڑائی ۲۵½ سینٹی میٹر ہے۔ جلد ۱۱ اور جلد ۲۷ کے شمارے چار ۴ کالمی ہیں۔

جلد ۲۶ کا شمارہ دُو کالماں ہے۔ اس شمارے کا ورق گلابی رنگ کا ہے۔ صرف جلد ۲۰ کے شمارے کا ورق چکنا نہیں ہے جو شاید جنگ عظیم دوم کے زمانے میں کاغذ کی قلت اور معمولی کاغذ پر طباعت کی وجہ سے تھا۔ مذکورہ تینوں شماروں کی کتابت اور طباعت معمولی ہے۔ زیادہ مواد کو محدود صفحات میں کھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔

روزانہ اخبار بریلی کے جن شماروں کے اوراق میرے پیشِ نظر ہیں ان کا اشاریہ مندرجہ ذیل ہے:۔

شمارہ مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۲۸ء

نصف سرورق پر چار ۴ کالموں میں قاضی عاشق حسین عاشقؔ بریلوی کی، ۱۳ اشعار پر مشتمل ایک نظم بعنوان "خان بہادر محمد محبوب علی خاں صاحب مرحوم اور کونسل صوبہ متحدہ کی ممبری" ملتی ہے۔ اس نظم میں خان بہادر محمد محبوب علی خاں، رئیس اعظم آنولہ بریلی، کی نینی تال میں وفات پر اظہار تعزیت اور ان کے بھائی المعروف بہ کمہ میاں کو ان کی جگہ ممبر بنانے کی اپیل کی گئی ہے۔ صفحہ ۲ پر پہلے تین ۳ کالموں کا عنوان ہے "مراسلات" اور ضمنی سرخیاں ہیں "زراعت ہند" "انگریزی ترجمۃ القرآن مولفہ حضرت مولانا محمد علی صاحب لاہوری" اور سر میلکم ہیلی گورنر یوپی کی ایک تقریر کا خلاصہ ملتا ہے۔ مضمون "زراعت ہند" جو لارڈ اروِن وائسرائے ہند کی تقریر کا خلاصہ ہے، اس کے خلاصہ نگار کے نام کی جگہ قوسین میں "نکتہ سنج" شایع ہوا ہے۔

شمارہ مورخہ ۷ فروری ۱۹۴۳ء

اس شمارے کے صفحہ گیارہ ۱۱ اور صفحہ بارہ ۱۲ پر میونسپل بورڈ بریلی کے پاس شدہ ۱۳۱ ریزولیوشنوں کی نقل منجانب چیرمین میونسپل بورڈ بریلی شایع ہوئی۔ ان میں ریزولیوشن

نمبر ۱۵ بزبان انگریزی سر سکندر حیات کی وفات پر تعزیت کے سلسلے میں ہے۔ صفحہ بارہ ۱۲ پر پہلے کالم میں عاشق حسین عاشقؔ بریلوی کی نظم ملتی ہے جس کا عنوان بوجہ دریدگی ورق پڑھنے میں نہیں آیا لیکن اشعار کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ عظیم دوم کے زمانے میں چھوٹی رقوم کے سکے ناپید ہونے کی وجہ سے غربا کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا اور حکومت نے چھوٹے سکے رائج کرکے اس پریشانی کو دور کیا۔ شاعر نے اس پہلو کو سامنے رکھ کر حکومت کی تعریف کی۔ اسی کالم میں یہ خبر شایع ہوئی "سندھ نے یوپی سے چار لاکھ من گڑ خریدا"۔ خبر کے مطابق گُڑ کا نرخ پونے پانچ آنے فی سیر تھا گویا موجودہ شرح میں تیئس ۲۳ پیسے فی کلو!

کالم دو ۲ میں خبریں شایع ہوئیں جن کی سرخیاں مندرجہ ذیل ہیں:

کلکتہ کے دفاعی انتظامات بہت مستحکم ہیں۔ لوگوں کا حوصلہ بلند۔ ترکی وفد کے قائد ایم اتائی کا بیان۔

مسٹر چرچل کے لیے چاندی کا سگرٹ کیس۔

پنجاب کے شہروں میں جلوس نکالنے کی ممانعت۔ ڈیفنس قانون میں ایک سال کیلئے مزید توسیع کردی گئی۔

سرکاری ملازموں کو مزید الاؤنس۔

آٹھ لاکھ اسّی ہزار ٹن کے جہاز امریکہ نے جنوری میں تیار کیے۔

پولیس کی وردیوں میں ڈاکہ۔ گیہوں کی پڑتال کرنے کا بہانہ۔

ڈھائی سو بوری گیہوں پکڑا گیا۔

یہ خبریں کل ہند نوعیت کی اور دلچسپ ہیں۔ سرخیاں ذہانت سے تیار کی گئی ہیں۔

شمارہ مورخہ ۷؍اگست ۱۹۴۴ء

سرورق۔ چار کالمی۔ دو کالموں میں قاضی محمد عاشق حسین عاشق بریلوی کی نظم "فیشن کی ہوا"۔ اس نظم میں انتیس (۲۹) اشعار ہیں۔ شاعر نے مردوں اور عورتوں میں فیشن کی ہوا کی مذمت اس بنیاد پر کی کہ فیشن کرنے سے خرچ زیادہ ہوتا ہے جب کہ ذاتی آمدنی کا تناسب کم ہوتا ہے۔ اس نے مشورہ دیا کہ ؎

چاہیے ہو کر بڑھانا کچھ وقارِ زندگی — قیمتی اشیاء سے فیشن کے مناسب ہے حذر

کالم تین (۳) کا عنوان ہے "لوکل" اس عنوان کے تحت میونسپل بورڈ بریلی کے ہونے والے انتخاب کے سلسلے میں بعض ناموں کی سفارش کی گئی ہے۔ کالم چار (۴) میں تین (۳) خبریں ہیں:

۱۔ "بریلی ہندو مہا سبھا کا ایک مختصر جلسہ"۔ یہ جلسہ گاندھی جناح ملاقات کے خلاف ہوا تھا۔

۲۔ "مہتر یونین بریلی"۔ اس خبر میں مہتروں کو موسم برسات کے اختتام تک ہڑتال سے باز رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

۳۔ "مدرسہ اشاعت العلوم سرائے خام کے جلسہ ہائے سالانہ"۔ اس خبر میں جلسوں کی کارروائی کے علاوہ یہ بھی اطلاع دی گئی کہ ولائتی آتشبازی کے نہ ملنے کی وجہ سے بریلی کے مسلمانوں نے شب برات کے موقع پر آتش بازی میں حصہ نہیں لیا۔

صفحہ دو (۲) بھی چار کالمی ہے اور ان میں جنگ عظیم دوم کی مفصل خبریں ملتی ہیں لیکن خبر رساں ایجنسی کا حوالہ نہیں ملتا ہے۔ خبروں کے عنوانات ہیں "جنگ کی رفتار"، "روسی فتوحات"، "مغربی اور جنوبی محاذ"، "مشرق بعید" اور "برما اور جاپان"۔

مذکورہ اخبار کے شماروں سے جو قلیل معلومات ہدست ہوئیں ان سے یہی اندازہ

ہوا کہ اس کی پالیسی صلح کن تھی اور اس نے شہری و کل ہند سطح پر خود کو کسی دھڑے سے وابستہ نہیں کیا اور تجارتی اطوار پر بھی اس کو جاری رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے لگاتار تینتیس (۳۳) برس عوام کی خدمت کی اور ۱۹۴۹-۵۰ء کے پُر آشوب ماحول میں اس کے مدیر کے ترکِ وطن کی وجہ سے اس کی اشاعت بند ہوئی۔

عرش مجھے ہفتہ وار عرش بریلی کا صرف ایک شمارہ بابت مئی ۱۹۳۶ء فراہم ہوا جو اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد آٹھ۔ ورق کی لمبائی ½ ۴۰ سینٹی میٹر چوڑائی ½ ۲۵ سینٹی میٹر۔ کالموں کی تعداد تین (۳) اور سطر ۴۴ سطری ہے۔ مقام اشاعت عرش پریس بڑا بازار بریلی اور کتابت و طباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ کاغذ چکنا۔ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر رئیس الدین رئیس بریلوی۔ جوائنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر محمد شریف خاں۔ صرف سرورق اور آخری صفحہ سرخ روشنائی سے۔ سرورق پر یہ شعر ملتا ہے ؎

فرش پر عرش کی تجلی ہے — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

سرورق پر ہی عاشق حسین سیماب اکبرآبادی (م ۱۹۵۱ء) کی نظم "اساس کائنات" جس کا مطلع ہے ؎

بے خودی میں کل کسی آزاد نے کہدی یہ بات — ہے محبت ہی سے پردہ داریٔ رازِ حیات

صفحہ ۲ سے صفحہ ۸ تک جو مواد شایع ہوا، وہ اشتہارات اور عدالتی سمن کے علاوہ مندرجہ ذیل نوعیت کا ہے:

۱۔ تاریخی مضمون "جھانسی کی رانی"۔ مضمون نگار کا نام نہیں ملتا۔ (ص ۲)

۲۔ میونسپل بورڈ بریلی کے متعلق ایسی خبریں جو نکتہ چینی پر مبنی ہیں جیسے "مسلم مدارس میں ٹیچرس کی حق تلفی"، "ڈبلو آئی ایم ہائی اسکول بریلی"۔ "زعفرانیات" (ص ۳)

۳۔ سیاسی تبصرے اور خبریں مثلاً "دہشت انگیزی اور گورنمنٹ (ص ۴)۔ "اچھوت کانفرنس اور علمائے اسلام" (ص ۳)۔ "شہنشاہ حبش جیفہ میں (ص ۳)۔ "غازی انور پاشا کا آخری مکتوب" (ص ۵)

۴۔ مقامی سیاسی رہنماؤں اور انتخاب پر تبصرہ۔ جیسے "انتخاب لیجسلیٹو اسمبلی یوپی اور مولوی عزیز احمد خاں صاحب ایڈووکیٹ"۔

۵۔ ادبی مضمون مثلاً "کلمات" جس میں عورت و مرد کے احساسات و انفعال کا تجزیہ کر کے عورت کی فضیلت ثابت کی گئی ہے۔

۶۔ لطائف۔

ان مضامین کو پڑھنے کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ مدیر نے اخبار کے معیار کو اونچا کرنے کی سعی کی اور عوامی دلچسپی کا خیال رکھا لیکن ان مضامین کو پڑھنے کے بعد جن کا تعلق میونسپل بورڈ بریلی کی کارکردگی سے ہے اور جن کا تعلق مقامی سیاسی رہنماؤں سے ہے، یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اخبار کا بنیادی مقصد میونسپل بورڈ بریلی اور بریلی کے سیاسی رہنماؤں پر نکتہ چینی کرنا تھا اور دیگر مضامین بطور زیب داستان ہیں۔ تاہم نکتہ چینی کا رویہ ادبی اسلوب میں ہے اور پیرایۂ بیان مزاحیہ اور ظریفانہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "عرش" کے عہد تک بریلی کے تقریباً چورانوے برس کو محیط تاریخ صحافت میں پہلی بار ایسا ہوا کہ مدیر کا منھ بند کرنے کے لیے اس کو اور اس کے اہلِ خاندان کو ملازمت دی گئی۔ خان بہادر شاکر داد خاں چیرمین میونسپل بورڈ بریلی نے مدیر "عرش" کے برادر خورد کو اکٹرائے انسپکٹر کی جگہ دی۔ خود مدیر "عرش" کو جو ہائی اسکول کا امتحان بھی پاس نہیں تھا، اکٹرائے انسپکٹر بنایا (۱۹۳۳ء) مدیر "عرش" کے سب سے چھوٹے

بھائی کو خاں صاحب معین خاں ممبر میونسپل بورڈ بریلی و اسسٹنٹ کنٹرولر آف اسٹورس او ٹی ریلوے آئزٹ نگر بریلی نے اپنے محکمے میں ملازمت دی۔ اس طرح "عرش" اپنے اعلیٰ معیار کے باوجود شخصی مفاد سے وابستہ ہو گیا۔ یہ آغاز اتنا غلط تھا کہ ظریفانہ نکتہ چینی نے الزام و اتہام تراشی کی جگہ لی اور رفتہ رفتہ معیار صحافت گرتا چلا گیا۔

ہفتہ وار "عرش" بریلی کا اپنا پریس تھا۔ مالی حالت بھی مضبوط تھی۔ مدیر "عرش" کو اختر رضا بسولوی (م ۱۹۶۰ء) جیسے صاحب قلم قوم پرست صحافی کا تعاون بھی میسر تھا۔ مجموعی طور پر اخبار معیاری اور دیدہ زیب تھا لیکن خان بہادر شاکر داد خاں نے بالآخر مدیر "عرش" کو ملازمت دے کر اس کو ۱۹۴۳ء میں بند کرا دیا۔ مدیر "عرش" جناب رئیس الدین ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۴ء (م ۱۴ جنوری ۱۹۵۴ء) نے اپنا تمام وقت میونسپل بورڈ بریلی کی ملازمت اور سیاست میں صرف کیا۔ "عرش پریس" ختم ہو گیا اور شعر و شاعری کی محفل جو رئیس الدین کے یہاں جمی رہتی تھی اور جس میں شکیل احمد شکیل بدایونی (م ۱۹۷۰ء) شاہد عزیز روش صدیقی (م ۱۹۷۱ء) احمد بخش آبر گنوری (م ۱۹۷۳ء) سید علی احسن مارہروی (م ۱۹۵۹ء) عاشق حسین سیماب اکبرآبادی (م ۱۹۵۱ء) قمر الحسن قمر بدایونی (م ۱۹۴۱ء) اور سردار احمد خاں بہزاد لکھنوی (م ۱۹۵۱ء) نے شرکت کی اور ہفتوں قیام کیا، اجڑ گئی۔ رئیس الدین کے دم سے ہی شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی، محمد صمد یار خاں ساغر نظامی، محمد حفیظ حفیظ جالندھری، محمد اصغر شعری بھوپالی اور احسان الحق احسان دانش جیسے نامور شعراء بریلی آئے، مشاعروں میں شرکت کی اور بریلی کی محفل سخن کو چکا چوند کیا۔ عرش پریس بریلی سے ہی بہزاد لکھنوی کا مجموعۂ کلام "نقوش بہزاد" شایع ہوا۔ یہ حق ہے کہ رئیس الدین کی میزبانی اور سخن پروری سے کم سے کم اس صدی میں بریلی میں اتنی کثرت

سے اساتذہ سخن کی مسلسل آمد نہیں ہوئی۔ صد حیف کہ میونسپل بورڈ بریلی کی سیاست نے جہاں "عرش" کو راہ سے ہٹایا وہاں اس کے مدیر کی سخن پروری کا بھی گلا گھونٹ دیا۔

ہفتہ وار "عرش" بریلی کے ۱۹۴۳ء میں بند ہونے کے بعد اختر مرزا بسولوی نے "العرش" بریلی جاری کیا اور اس کے بند ہونے کے بعد "العرش جدید" کا اجرا کیا۔ ممکن ہے رئیس الدین کے ایما پر یہ اخبارات جاری ہوئے ہوں۔ لیکن اختر مرزا بسولوی کے تعاقب میں برٹش سرکار کے جاری کردہ وارنٹ گرفتاری رہتے تھے۔ ان کی کتاب "محشر لکھنؤ" بھی ضبط کی جا چکی تھی۔ ان حالات میں اختر مرزا بسولوی اخبار کیا چلاتے، گرفتاری سے بچنے کے لیے روپوش ہو جاتے تھے۔ اسی سلسلے کی آخری کڑی اختر مرزا بسولوی اور سید ابراہیم حسن رسا بریلوی کا ہفتہ وار "ندرت" بریلی تھا جس کا تعارف آئندہ پیش کیا جائیگا۔

روہیلکھنڈ اخبار اسی نام کے اخبار کا حوالہ مقالات گارساں دتاسی جلد اول میں ملتا ہے (ص ۹۲) گویا روہیلکھنڈ اخبار بریلی سے ۱۸۶۷ء اور ۱۸۷۳ء کی مدت میں جاری ہوا۔ زیر نظر روہیلکھنڈ اخبار بریلی ۱۹۴۰ء میں جاری ہوا تھا۔ ایک ہی نام کے دو اخباروں میں کیا باہمی تعلق تھا، اس کی وضاحت سر دست ممکن نہیں ہے۔

میرے پاس زیر نظر روہیلکھنڈ اخبار بریلی کے مندرجہ ذیل شماروں کے صفحات محفوظ ہیں:

۷ جنوری ۱۹۷۷ء - ۱۴ جنوری ۱۹۷۷ء - ۲۱ جنوری ۱۹۷۷ء - ۲۶ جنوری ۱۹۷۷ء - ۴/۱۱ فروری ۱۹۷۷ء - ۴/۱۱ مارچ ۱۹۷۷ء - ۱۱/۱۸ مارچ ۱۹۷۷ء۔

مذکورۂ بالا شماروں کے ورق کی لمبائی ½ ۳۸ سینٹی میٹر اور چوڑائی ½ ۲۵ سینٹی میٹر ہے۔ تعداد صفحات آٹھ اور ہر صفحہ چار کالم کا ہے۔ کتابت اور طباعت معمولی۔ کاغذ سفید

اور معمولی۔ پرنٹر پبلشر پروپرائٹر ایڈیٹر تیج بہادر سنہا ایم اے۔ ایل ایل بی، مشیر قانونی۔ رجسٹرڈ آفس کنور ہر نرائن بھون۔ اوگریز پیلیس۔ ۱۲۵ درزی چوک بریلی۔ نام مطبع بریلی الیکٹرک پریس بریلی۔

ہفتہ وار روہیلکھنڈ اخبار بریلی کا روزانہ ہندی اڈیشن ۱۹۶۳ء میں جاری ہوا تھا لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ روزانہ ہندی اڈیشن کب تک جاری رہا اور کب بند ہوا۔

روہیلکھنڈ اخبار بریلی کے مذکورہ بالا شماروں میں جملہ اہم مضامین انگریزی زبان میں ہیں جن کو تیج بہادر سنہا نے تحریر کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیج بہادر سنہا نے روہیلکھنڈ اخبار کو جاری رکھنے کے لیے اس کو اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی شایع کیا اور اس کے زیادہ تر مضامین بھی خود ہی تحریر کیے۔

تیج بہادر سنہا کا انتقال ۱۲ ستمبر ۱۹۷۷ء کو ہوا اور ہفتہ وار روہیلکھنڈ اخبار بریلی ان کی وفات کے ساتھ ہی بند ہو گیا۔

روہیلکھنڈ اخبار کے مالک اور مدیر تیج بہادر سنہا ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ انکے والد دادا اور پردادا سب ہی زمیندار تھے۔ بریلی سے شاہ جہاں پور جانے والی سڑک کے کنارے، بریلی سے دس کلو میٹر دور پرآتاس۔ پرسونا اور ٹھریا نجابت خاں نام کے مواضعات ان کی زمینداری میں شامل تھے۔ شہری جائداد اس کے علاوہ تھی۔ ان کے خاندان میں انگریزی تعلیم اور انگریز حکام سے تعلقات کی دیرینہ روایت تھی۔ ان کے دادا لال بہادر سنگھ (م ۱۹۲۶ء) نے ایم اے او کالج علی گڑھ سے ۱۸۸۰ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا تھا اور دوران تعلیم ان کا قیام سر سید احمد خاں

(م ۱۸۹۷ء) کی کوٹھی میں ہی ہوا تھا۔ تیج بہادر سنہا نے تمام عمر گھر کے باہر جاتے وقت مغربی لباس زیب تن کیا۔ ان کی علمی استعداد بہت زیادہ تھی اور وہ خود بھی بہت ذہین انسان تھے۔ ان کا مزاج کچھ اس طرح کا تھا کہ اگر وہ کسی سے متاثر ہو جاتے تو اس کی بہت تعریف کرتے تھے اور اگر ناراض ہو جاتے تھے تو نظر انداز کرنے والے شخصی نقائص کا اظہار بھی کر دیتے تھے۔ ان کو اس رویے سے داد تو نہیں ملی البتہ انہیں بے داد کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان کی اس مزاجی کیفیت کا اظہار ان کی تحریرات سے ہوتا ہے۔ مثلاً انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی (م ۱۹۷۷ء) کی وفات پر ایک عمدہ تعزیتی مضمون قلم بند کیا لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی تحریر میں جو بازپرسی کا رویہ اختیار کیا وہ مناسب نہیں تھا۔

"پروفیسر نورالحسن نے جو آج کل حکومت ہند کے وزیر تعلیم ہیں ایک مرتبہ ملک کے جلیل القدر رہنماؤں میں جن میں مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو بھی شامل تھے اور بڑے بڑے عالموں میں جن میں ڈاکٹر تارا چند۔ ڈاکٹر بینی پرشاد اور ڈاکٹر ایشوری پرشاد بھی شریک تھے اور ملک کے نامور سیاست دانوں میں جن میں خود ان کے شعبۂ ریاضی کے صدر ڈاکٹر سر ضیاء الدین۔ سر شانتی سروپ بھٹناگر اور سر سی وی رمن بھی تھے۔ یہ اعلان کیا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی انقلاب فرانس کے زمانے کے انسائیکلو پیڈیائی عالموں کی برابری نہیں کر سکتا۔ اب میں ان سے براہ راست خطاب کر کے حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے علم کا حساب پیش کرتا ہوں اور دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اٹھارویں صدی کی معلومات کے محدود احاطہ میں جن علماء نے تمام معلومات اور علوم کا احاطہ کر لیا تھا کیا ان کی معلومات اس دریائے علوم سے بھی بلند و بالا تھیں .... اب صدق جدید کی اہمیت کا اندازہ لگائیے۔ اس کی ہر ہفتہ وار اشاعت کا تمام ہندوستان اور پاکستان میں بڑی بے تابی سے انتظار رہتا تھا۔ دونوں ملکوں میں تمام اردو اخبارات اور رسائل ہر ہفتہ صدق جدید کی سچی باتیں اور شذرات شیر مادر کی طرح اپنا حق سمجھ کر پوری کی پوری نگل جاتے تھے اور اس کے لیے کسی اجازت یا رسید کی ضرورت نہیں سمجھی گئی .... کیسی ذہنیت ہے علم و ادب کے تاجروں کی۔ بقول حضرت دلاور فگار بدایونی ایسا لگتا ہے کہ ع کتوں کو سر راہ ادب چھوڑ دیا ہے۔

حضرت مولانا کے علم و فضل کا اعتراف سرزمین ہند پر کبھی نہ ہو سکا۔ اس کا ذمہ دار وہ ماحول تھا جس میں علم کی سرپرستی کی تمام تر ذمہ داری ان ادب نما اور ادب خور عملے پر ڈال دی گئی تھی جو ان کے ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد دے رہا تھا۔"

(روہیلکھنڈ اخبار بریلی مورخہ ۱۲ر جنوری ۱۹۷۷ء۔ ص ۶۔ ص ۸)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیج بہادر سنہا اپنی انا کے خول میں بند رہے اور اپنی انا کی تسکین کے لیے اور اپنے خاندانی وقار کی صدائے بازگشت کے لیے قد آور شخصیتوں میں بھی نقائص کے پہلو تلاش کرتے رہے حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ان قد آور شخصیتوں کے علمی و ادبی گوشوارے میں ان کے محاسن کا اعتراف کرنے کے بعد ان کے کسی نقص کا اظہار نرم اور ہمدردانہ لہجے میں کرتے۔ روہیلکھنڈ اخبار بریلی میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن میں مدیر کے بازپرسی اور اتہام تراشی کے رویے کا شکار معروف شخصیتیں ہوئیں۔ یہاں صرف ایک مثال نواب مرزا داغ کے متعلق پیش کی جاتی ہے کہ مدیر نے کس طرح حقائق سے چشم پوشی کی اور اپنے نانا ڈاکٹر بھولا ناتھ (۱۸۴۸ء تا ۱۹۱۱ء) کے تعلق سے

نواب مرزا داغ کے تئیں سبک رویہ اختیار کیا۔ اس نے روہیلکھنڈ اخبار بریلی مورخہ ۷ر جنوری ۱۹۶۶ء میں تحریر کیا :-

" At Rampur he also became a poch with a strangetakhallus, Doctor. I have preserved a very long ghazal of his own with corrections made in red ink by Hazrat Ameer Meenai; its last line is غزل پیش کرنے کے Ghazal Pesh Karne KeQabil Ehi Hai - قابل یہی ہے When the great poet Dagh (حضرت داغ) was called by the Nawab, he wrote

لائے دہلی سے ایک مشکی کو آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

Dagh left for Delhi immediately"

حقیقت یہ ہے کہ نواب مرزا داغ بہ زمانۂ نواب یوسف علی خاں ناظم (م ۱۸۶۵ء) رامپور تشریف لائے، انھوں نے چوبیس [۲۴] سال رامپور میں قیام کیا اور نواب کلب علی خاں کی وفات (۱۸۸۷ء) کے بعد رامپور سے کوچ کیا۔ داغ کو داروغۂ اصطبل مقرر کیا گیا تھا۔ داغ کا رنگ مشکی تھا اور اصطبل میں گھوڑوں کو داغنے کا رواج تھا۔ ریاست رامپور کے اصطبل میں ہی ایک ماہر ہزل گو مجرد رامپوری ملازم تھا۔ اس نے داغ کی آمد پر یہ شعر کہا ؎

شہر دہلی سے آیا اک مشکی آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کے ورود رامپور کے وقت ڈاکٹر بھولا ناتھ کی عمر تقریباً چودہ برس کی تھی۔ لہٰذا اس عمر میں ان کی ریاست رامپور میں ملازمت تو درکنار تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی ہوگی[۵]

ڈاکٹر بھولا ناتھ کے متعلق جستجو کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا تخلص ڈاکٹر تھا اور وہ تیج بہادر سنہا کی محولہ بالا تحریر کی روشنی میں امیر مینائی (م ۱۹۰۰ء) کا شاگرد تھا۔ لیکن امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں اس کا ترجمہ نہیں دیا ہے جس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر بھولا ناتھ کی ملازمت اور تلمذ کا زمانہ انتخاب یادگار (۱۸۷۳ء) کے بعد کا ہے۔ البتہ ڈاکٹر بھولا ناتھ کا ذکر خمخانۂ جاوید (جلد ۳۔ ص ۲۲۳) میں اس طور پر ملتا ہے :

"ڈاکٹر رامپوری۔ ڈاکٹر بھولا ناتھ۔ ۱۸۹۹ء میں ریاست رامپور میں ملازم تھے۔ جدت کلام زود گوئی خوش کلامی اچھی زبان اور شوخ طبیعت آپ کے کلام کے جوہر ہیں ؎

یاد مژگاں کی جو ہے بادیہ پیمائی میں خوب کانٹوں کے مزے آبلہ پا لیتے ہیں
تو نے اے چرخ کبھی چین سے رہنے نہ دیا کٹ گیا دن تو بلائے شب فرقت آئی
بھولی صورت پہ یہ غصہ یہ ستم یہ شوخی ڈھل کے کیا حسن کے سانچے میں قیامت آئی

تیج بہادر سنہا کو چاہیے تھا کہ وہ اپنے نانا کی شاعری کو متعارف کراتے اور انکی شخصیت کے محاسن بیان کرتے لیکن انھوں نے یہ طور اختیار نہ کر کے داغ کے تئیں سبک رویہ اختیار کیا جس سے انکی صحافی ذمہ داری مجروح ہوئی۔

تیج بہادر سنہا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے۔ انھوں نے تاریخ کے مضمون میں ایم اے کی سند حاصل کی تھی۔ وکالت کا امتحان پاس کیا تھا۔ اجداد بھی تعلیم یافتہ تھے۔ مطالعہ وسیع تھا۔ لیتھوگرافی کا فن ان کو ورثے میں ملا تھا۔ انھوں نے دفتر زمانہ کانپور میں صحافت کا تجربہ حاصل کیا تھا[۵۶]۔ ان کی کمزوری ان کی انا تھی ورنہ ان میں اچھائیوں کی کمی نہیں تھی۔

انھوں نے ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت کے تہذیبی اثرات کا جائزہ لیا اور مثبت رائے پیش کی۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے واقعات پر مضامین تحریر کیے اور روہیلکھنڈ کی جدوجہد آزادی پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اپنی سوانح حیات بھی قلم بند کرنا شروع کر دی تھی جو نامکمل رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے روہیلکھنڈ اخبار بریلی کے ذریعے بڑا کام انجام دیا۔ ان کے مضامین کے ذریعہ روہیلکھنڈ اخبار بریلی کو کل ہند شہرت ملی اور اسکے مضامین دیگر اخبارات میں بھی شایع ہوئے۔ تیج بہادر سنہا نے تاریخی اور ادبی موضوعات پر لکھنے کی ترغیب پیدا کی اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔

تیج بہادر سنہا ایک ذہین سیاسی مبصر بھی تھے۔ انھوں نے آزاد ہندوستان کے مسائل جیسے خاندانی منصوبہ بندی، پچھڑے طبقے کی سرکاری ملازمتوں میں حصہ رسانی، جمہوریت اور الیکشن، سیاسی پارٹیاں، فرقہ واریت، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ سے قرض لینے وغیرہ کی پالیسی پر دانشورانہ انداز میں تبصرہ کیا۔ انھوں نے "بنیادی فرائض" کا نظریہ پیش کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ جملہ مذاہب کے ایسے فرائض کو جو آپس میں یکساں ہیں اور قریب تر ہیں یکجا کرکے قومی سطح پر رائج کیا جائے تاکہ باہمی فاصلے دور ہوں اور نزدیکیاں پیدا ہوں۔ ان کے سیاسی تبصرے پسند کیے جاتے تھے اور ان کے اخبار کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ روہیلکھنڈ اخبار بریلی نے بریلی کے دیگر اخباروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ شہرت پائی اور اس کی کل ہند سطح پر پذیرائی ہوئی۔

چونکہ تیج بہادر سنہا ایک خاص انداز کے انسان تھے، یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کے تعلقات اپنے اعزا اور احباب سے زیادہ دن قائم رہتے۔ عمر کے آخری ایام میں انکی اہلیہ کی وفات ہوئی، خود ان پر عارضہ قلب کا حملہ ہوا لیکن انھوں نے روہیلکھنڈ اخبار کی اشاعت

جاری رکھی اور تن تنہا جملہ کام خود کرتے رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے اخبار کو اپنی تحریرات سے بھرا اور بہ تخلص کیف اپنا کلام بھی شایع کیا۔ ان کے کلام شعر میں الیکشن اور نیتا در آئے جس کی وجہ سے ان کی غزلیات سیاست اور تغزل کا معجون مرکب بن گئیں۔ ان کے اشعار میں نہ کیف ہے اور نہ کیفیت۔ ان کے اشعار کو زیادہ سے زیادہ ظریفانہ کہا جا سکتا ہے۔

تاہم روہیلکھنڈ اخبار بریلی نے جو معیار صحافت پیش کیا اور جس استقلال سے تیج بہادر سنہا نے اس کو مرتے دم تک جاری رکھا اُس کی داد نہ دینا غیر منصفانہ فعل ہوگا۔ روہیلکھنڈ اخبار بریلی سینتیس[31] برس جاری رہ کر ۱۹۷۷ء میں بند ہوا۔

ندرت

سید ابراہیم حسن رسا بریلوی (م ۱۹۸۷ء) تلمیذ ضمیر حسن خاں دل شاہجہاں پوری (م ۱۹۵۸ء) اختر مرزا البسولوی کے دست راست کی حیثیت سے ان کے ہفتہ وار "العرش" بریلی اور "عرش" بریلی کے لیے کام کرتے تھے۔ جب مذکورہ اخبارات بند ہو گئے تو سید ابراہیم حسن رسا نے اختر مرزا البسولوی کے تعاون سے ۱۹۴۸ء میں "ندرت" کا اجرا کیا۔ "ندرت" کا دفتر ابراہیم حسن رسا کے رہائشی مکان واقع محلہ شاہ آباد کے ایک گوشے میں تھا اور شاہی پریس جس میں اس کی طباعت ہوتی تھی، نینی تال روڈ بریلی کے کنارے چھوٹے پل کے نیچے ایک بوسیدہ اور تاریک دوکان میں تھا۔ ابتدا میں شاہی پریس گلی خیر اللہ بازار درزی چوک میں قائم ہوا تھا۔ برٹش سرکار کے وارنٹ اختر مرزا بسولوی اور شاہی پریس کا تعاقب کرتے تھے۔ جب اختر مرزا البسولوی مجوزہ انٹی برٹش اشتہار لکھنے اور ان کو شاہی پریس میں طبع کرا کے مشتہر کرنے کی وجہ سے روپوش ہو جاتے، تو شاہی پریس بھی اپنی جگہ بدل دیتا تھا۔ شاہی پریس گلی خیر اللہ سے منتقل ہو کر محلہ

عقب کوتوالی میں قائم ہوا۔ وہاں سے بھی انٹی برٹش اشتہار شایع ہوئے۔ بالآخر شاہی پریس نینی تال روڈ پر چھوٹے پل کے نیچے منتقل ہوا۔ وہ ایسی محفوظ جگہ تھی جس کی نشاندہی مخبری کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ شاہی پریس آزادئ وطن کے بعد اور "ندرت" کے اجرا کے وقت اسی جگہ قائم تھا۔ بریلی میں انٹی برٹش کارروائیوں کے سلسلے میں جن محبان وطن نے مصائب کا سامنا کیا ان میں اختر مرزا بسولوی اور ابراہیم حسن رسا ناقابل فراموش افراد ہیں۔

میرے پیش نظر "ندرت" کا شمارہ ۱۱/۱۲ جلد نمبر ۱ مورخہ ۲۱/۲۸ مارچ ۱۹۶۵ء ہے۔ یہ چار صفحات کا ہفتہ وار اخبار ہے۔ ورق کی لمبائی ۳۸ ۱/۲ سینٹی میٹر اور چوڑائی ۲۵ ۱/۲ سینٹی میٹر ہے۔ کاغذ سفید معمولی۔ چار کالماں۔ کتابت خفی لیکن صاف۔ بین السطور مناسب فاصلہ۔ طباعت اچھی۔ سرورق پر مندرجہ ذیل شعر درج ہے ؎

ندرت مجھے کہتے ہیں شہرت ہے بہت میری
اس دور کشاکش میں خدمت ہے بہت میری

اس شمارے کا اشاریہ مندرجہ ذیل ہے:

صفحہ ایک درمیانی دو کالم میں "مصور فطرت حضرت عبرت صدیقی بریلوی" کی غزل بعنوان "خرام بہار"۔ اس کے بعد ایک خبر بعنوان "انصاف کا تقاضہ کیا کہتا ہے"۔ اس خبر میں چیرمین میونسپل بورڈ بریلی پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ کالم تین اور کالم چار کا عنوان ہے "بریلی میونسپل بورڈ کی خبریں۔ جس کو پیا چاہے وہی سہاگن کہلائے"۔ اس تحریر میں بھی چیرمین میونسپل بورڈ بریلی کی نکتہ چینی کی گئی ہے۔ کالم چار میں ہی یہ عنوان ملتا ہے "انکروچمنٹ ایک بدنما داغ ہے" جس کے ذیل میں میونسپل بورڈ بریلی کی آراضی پر ناجائز قبضے کی نشاندہی کی گئی ہے اور ساتھ ہی میونسپل بورڈ بریلی کی حرف گیری۔ صفحہ دو پر ساڑھے تین کالم میں اداریہ بعنوان "وطن کی آبرو خطرہ میں ہے" ملتا ہے۔ پورا اداریہ حرف نکتہ چینی اور حرف گیری کا

نمونہ ہے۔ اسی کالم کے باقی ماندہ حصے میں تجارتی اشتہارات ہیں جن میں ایک اشتہار خود "ندرت" کا ہے۔ صفحہ تین پر پونے چار کالموں میں "شاندار مشاعرے" کی روداد چھپی ہے جو ۲۰ مارچ ۱۹۶۵ء کو مرزا انور بیگ چغتائی المتخلص بہ انور چغتائی کے مکان واقع مولانگر بریلی میں مولوی محمد حسین وکیل ایم ایل اے کی صدارت میں ہوا تھا۔ کالم چار کے آخر میں یہ خبر شایع ہوئی "ژالہ باری اور باد و باراں" جس کا تعلق ۱۹ مارچ ۱۹۶۵ء کو بریلی میں ژالہ باری اور باد و باراں کے نتیجے میں ہوئے نقصان سے ہے۔ صفحہ چار پر ہر کالم میں عدالتی سمن ملتے ہیں۔

اس اشاریے سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) ہفتہ وار "ندرت" ایک مقامی اخبار تھا (۲) "ندرت" کا نشانہ میونسپل بورڈ بریلی تھا (۳) "ندرت" کی تحریر میں ناراضگی جھلاہٹ اور بیزاری کا اسلوب تھا۔ (۴) "ندرت" شاعری اور شاعر نواز تھا۔

دراصل رئیس الدین مدیر "عرش" بریلی نے میونسپل بورڈ بریلی پر جس نکتہ چینی کا آغاز کیا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس رویے کی توسیع "ندرت" میں ہوئی کیونکہ اختر مرزا بسولوی "عرش" سے "ندرت" تک ایک قلم بردار فرد مشترک تھے۔

سید ابراہیم حسن رسا کو آزادئ وطن کے بعد بھی چین نہیں ملا۔ وہ کسی نہ کسی پریشانی کا شکار ہوتے رہے۔ منشائے ایزدی، ان کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ ایسے میں "ندرت" کیا چلتا۔ اس کو بند کرنا پڑا۔ انھوں نے "ندرت" کو ماہانہ چلانے کی کوشش کی اور چھ سات شمارے شایع بھی کیے لیکن اس کو بھی بند کرنا پڑا۔ عمر آخر میں وہ اپنے فرزند کے پاس دہلی گئے، اور دہلی میں ہی ان کی وفات ہوئی۔[۱۲]

بریلی کا سفر صحافت جو ۱۸۴۶ء میں عمدۃ الاخبار کے اجراء سے شروع ہوا تھا۔ خوددار دو صحافت کے ارتقائی منازل کی شناخت کراتا ہے۔ یہ سفر تعلیمی و اصلاحی رجحان سے شروع ہو کر بازپرسانہ صحافت تک پہنچا۔ یہ سفر اب بھی جاری ہے۔ اس دور کشاکش میں اس کی حیثیت مقامی بن چکی ہے۔

حواشی

[6] میری ننھیالی حویلی محلہ عقب کوتوالی بریلی میں تھی۔ سید الطاف علی بریلوی میرے حقیقی ماموں تھے جن کے دو منزلہ مکان میں روزانہ اخبار بریلی کا مطبع اور دفتر تھا۔ لہٰذا میں نے یہ تحریر اپنی ذاتی واقفیت پر تحریر کی ہے۔ [7] ویسٹرن انگلس میموریل ہائی اسکول بریلی۔ اس کی بنیاد کلکٹر بریلی انگلس نے ۱۸۶۰ء میں رکھی تھی۔ ابتدا میں اس کا نام مدرسۂ انگلس گنج تھا۔ اپنے زمانے کا شہرت یافتہ اسکول ہے۔ اسی کلکٹر نے شہر کہنہ بریلی میں ایسٹرن انگلس میموریل اسکول کا آغاز کیا۔ اب یہ انٹر کالج ہے۔ اول الذکر کا نام تلک انٹر کالج ہے اور بعد الذکر کا مولانا آزاد انٹر کالج بریلی۔ [8] یہ معلومات تیج بہادر سنہا کے خودنوشت سوانحی حالات پر مبنی ہیں جو انھوں نے روہیلکھنڈ اخبار بریلی میں مورخہ ۲ جنوری ۱۹۷۷ء کو بزبان انگریزی شائع کیے۔ سنہا صاحب سے میری بھی یاد اللہ تھی۔ [9] ہم نے اس شعر کے متعلق تفتیش کی۔ اکبر علی خاں عرشی زادہ رامپوری نے اپنے خطوط مورخہ ۲ جولائی اور ۷ جولائی ۱۹۹۳ء میں تحریر کیا کہ مذکورہ شعر مجرد رامپوری کا ہے جو بہترین ہزل گو اور ریاست کے اصطبل میں ملازم تھا۔ اس کی بیاض شاعری اب نہیں ملتی۔ چونکہ وہ ملازم ریاست تھا لہٰذا اس کا نام پوشیدہ رہا اور روایت سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی۔ [10] تیج بہادر سنہا نے روہیلکھنڈ اخبار بریلی مورخہ ۲ جنوری ۱۹۷۷ء میں تحریر کیا کہ:

"۱۹۳۸ء میں مجھے منشی دیانرائن نگم مدیر "زمانہ" اور "آزاد" کے دفتر میں ساون دن کام کرنے کی سعادت حاصل تھی۔"

تیج بہادر سنہا نے اسی اخبار کی ۲ جنوری ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں تحریر کیا تھا کہ:

"لیتھوگرافی کا فن میرے خاندان کی چار پیڑیوں سے مجھے براہ راست پہنچا ہے۔"

[11] یہ مشاعرہ تبارک علی صدیقی المتخلص بہ عبرت کے کراچی منتقل ہونے پر منعقد ہوا تھا۔ عبرت صدیقی اپنے عمدہ اخلاق اور شاعری کی وجہ سے بریلی میں مقبول تھے اور ان کے تلامذہ بھی بہتر شاعر تھے۔ انور چغتائی ان کے ہی شاگرد ہیں۔ عبرت صدیقی نے ۱۹۹۰ء میں کراچی میں وفات پائی۔ [12] ہم نے سید ابراہیم رسا کے عمر آخر کے حالات ان کے چھوٹے بھائی سید عابد حسن کلیم سے معلوم کرکے تحریر کیے ہیں۔

حوالجات

مقالات گارساں دتاسی۔ جلد اول۔ مترجمہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں و پروفیسر عزیز احمد۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔ ۱۹۴۳ء۔

روداد ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن جے پور ۱۹۴۳ء۔ مخزونہ مولانا آزاد لائبریری۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

یادگاری مجلہ کل ہند سیمینار شیو برت لال برمن۔ شعبۂ اردو۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ دیوان راجہ عنایت سنگھ عنایت۔ ناقص الاول۔ مطبوعہ ۱۹۰۰ء۔

خمخانۂ جاوید۔ سری رام۔ جلد سوم۔ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی۔ ۱۹۱۷ء۔

مقالہ "حضرت مفتی عنایت احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور بریلی کا کتب خانہ" مولفہ سید بدرالدین علوی، استاد شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۵۲ء۔

استاذ الاساتذہ ملا عبدالسلام اعظمی دیوی

از ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی، علی گڑھ

ہندوستان میں معقولات اور علم کلام کی زیادہ ترقی و اشاعت جلال الدین محقق دوانی (۹۰۸ھ/۱۵۰۲ء) کے تلامذہ سے ہوئی۔ ان کے ارشد تلامذہ میں خواجہ جمال الدین محمود تھے جن کا دیرپا سلسلۂ تلمذ ان کے دو شاگردوں میرزا جان شیرازی اور امیر فتح اللہ شیرازی (۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء) سے چلا۔ موخر الذکر جب بیجاپور سے اکبری دربار میں آئے تو شہرت و ناموری کے اوج پر پہنچے اور پورے ملک میں علوم عقلیہ کی ترویج و اشاعت زور وشور سے شروع ہوگئی جس کے نتیجہ میں بلند پایہ علمائے معقولات پیدا ہوئے۔ شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (۹۹۸ھ/۱۵۸۹ء) ملا عبدالسلام لاہوری (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) ملا عبدالسلام دیوی، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی (۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶ء) ملا کمال الدین کشمیری، ملا عصمت اللہ سہارنپوری (۱۰۳۹ھ/۱۶۳۰ء) ملا محمود جونپوری (۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء) اور ملا عبدالحلیم سہالوی جیسے بے شمار علماء اپنے اپنے عہد میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور ان کے سامنے جن فضلا نے زانوئے تلمذ تہ کیا یا جنھوں نے ان کے تلامذہ سے اکتساب فیض کیا وہ بھی اپنے زمانے کے ائمہ معقولات ہوئے اس سلسلہ میں اودھ کے علماء نمایاں ہیں۔

امیر فتح اللہ شیرازی (۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء) کے شاگرد رشید ملا عبدالسلام

لاہوری کے شاگرد ملا عبدالسلام دیوی اور ان کے ملا عبدالحلیم سہالوی ہوئے۔ ملا عبدالحلیم سہالوی کے ارشد تلامذہ میں انکے بیٹے ملا قطب الدین شہید (۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء) اور انکے شاگرد اور فرزند ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) ہیں۔ ملا کمال الدین سہالوی (۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء) نے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل اپنے استاد ملا نظام الدین فرنگی محلی (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) سے کی اور اس طرح وہ خیرآبادی خاندان کے مورث اعلیٰ ہوئے کہ علامہ فضل امام خیرآبادی (۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء) وغیرہ کا سلسلۂ تلمذ ان ہی کے واسطے سے ملا نظام الدین فرنگی محلی (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) تک پہنچتا ہے۔

ملا عبدالسلام دیوی اعظمی اپنے عہد کے امام معقولات اور استاد الاساتذہ ہیں لیکن اکثر ہندوستانی مشاہیر کی طرح ان کے حالات زندگی بھی پردۂ خفا میں ہیں۔ راقم السطور کو باوجود تلاش و تفحص کے ان کے مفصل حالات معلوم نہیں ہوسکے یہانتک کہ ان کی ولادت و وفات کے سنین کی صراحت بھی کسی تذکرہ میں نظر سے نہیں گذری۔ ان کے معاصر تذکروں، شاہجہاں نامہ، طبقات شاہجہانی، عمل صالح وغیرہ اور بعد کے تذکروں، مآثر الکرام، بحر زخار وغیرہ میں بھی ان کا ذکر نہایت مختصر ہے۔ ان کے تفصیلی حالات کا سب سے اہم ماخذ شیخ خیرالزماں لکھنوی کی "باغ بہار" ہے۔ دوسرا اہم ثانوی ماخذ مولانا حافظ شاہ علی حیدر قلندر کاکوروی کی "تذکرۂ مشاہیر کاکوروی" ہے۔ علاوہ ازیں کشف المتواری فی حال نظام الدین قاری۔ مولفہ مولانا شاہ تراب علی قلندر کاکوروی اور نفحات النسیم فی تحقیق احوال اولاد ملا عبدالکریم مولفہ منشی امیر احمد علوی کاکوروی (ڈپٹی کلکٹر) میں بھی ان کے بارہ میں کچھ معلومات ملتی ہیں۔ انہی تذکروں کی مدد سے اس فاضل اجل اور استاذ الاساتذہ کے بارے میں یہ سطور قلم بند کی جارہی ہیں۔

خلاصۂ آداب و قوانین المعروف بہ اسم تاریخی باغ بہار (۱۲۱۱ھ) کے مولف علی غنی عرف شیخ محمد خیر الزماں لکھنوی (۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء) بن محمد وجیہ الزماں اعظمی نقوی، ملا صاحب مذکور کے احفاد میں ہیں۔ ان کے تذکرہ کی بنیاد بعض خاندانی بیاضوں اور آبائی شجروں پر ہے۔ اس کے تین نسخے راقم احقر کے علم میں ہیں۔ اول الذکر نسخہ کتب خانہ انوریہ۔ خانقاہ کاظمیہ کاکوری میں ہے۔ دوسرا فرنگی محل لکھنؤ میں ابوالاحیار مولانا محمد نعیم انصاری فرنگی محلی (۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء) کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ تیسرا نسخہ شعبۂ فزیالوجی۔ میڈیکل کالج، مسلم یونیورسٹی کے سابق صدر ڈاکٹر سید وجیہ الحسن صاحب مرحوم کی ملک تھا۔ اول الذکر دونوں نسخے کسی کم علم کاتب کے لکھے ہوئے ہیں۔

ملا سید عبدالسلام اعظمی دیوی شاہجہانی عہد کے سربرآوردہ اور ذی علم شخص تھے۔ آبائی وطن دیوہ ضلع بارہ بنکی تھا، ننہال کاکوری (ضلع لکھنؤ) تھا چنانچہ اپنے نانا حضرت مخدوم ملا عبدالکریم علوی (۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء) نبیرۂ حضرت مخدوم قاری شیخ نظام الدین بھکاری (۹۸۱ھ/۱۵۷۴ء)[1] کے پاس رہ کر تعلیم و تربیت حاصل کی۔ بعدازاں لاہور جاکر ملا عبدالسلام لاہوری (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) سے اکتساب کیا۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ ملا عبدالسلام دیوی چونکہ حضرت مخدوم سید اعظم ثانی لکھنوی[2] کی اولاد میں تھے۔ جیساکہ ان کے نسب نامہ سے اندازہ ہوجائیگا۔

[1] موصوف کے حالات کے لیے راقم کا مقالہ معارف۔ دار المصنفین۔ اعظم گڑھ جولائی۔ اگست ۱۹۸۵ء نیز اسکی کتاب "کواکب" ملاحظہ ہوں [2] حضرت سید مخدوم شیخ اعظم ثانی اپنے عہد کے ایک متبحر عالم، علوم ظاہری و باطنی کے جامع اور فقہ حنفی میں ممتاز تھے۔ عرب و عجم میں اپنی علمی لیاقت، فضل و کمال اور تصنیفات کی وجہ سے مشہور تھے۔ ۲۱ شوال ۸۷۰ھ/۱۴۶۶ء کو لکھنؤ میں وفات پائی اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

اس واسطے وہ اپنے نام کے ساتھ اعظمی لکھتے تھے، لیکن مولانا عبدالقدوس صاحب کا یہ بیان درست نہیں ہے کہ وہ دیوہ (ضلع اعظم گڈھ) کے رہنے والے تھے۔[1]

سلسلۂ نسب اور خاندانی حالات

ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: ملا سید عبدالسلام (۱) ابن مولوی ابوسعید (۲) ابن مولوی محب اللہ برخوردار (۳) ابن مولوی عبدالرحیم فیاض (۴) ابن مولوی احمد فیاض (۵) ابن حضرت مخدوم شیخ اعظم ثانی لکھنوی (۶) ابن شاہ ابوالبقا (۷) ابن محمد موسیٰ (۸) ابن شاہ ضیاء الدین (۹) ابن شاہ شجاع کرمانی (۱۰) ابن امیر مبارز الدین (۱۱) ابن امیر مظفر (۱۲) ابن خواجہ غیاث الدین (۱۳) ابن امیر محمود (۱۴) ابن امیر علی (۱۵) ابن امیر احمد علی (۱۶) ابن امیر جعفر (۱۷) ابن امیر عبداللہ (۱۸) ابن سید علی اصغر (۱۹) ابن امام محمد تقی (۲۰) ابن امام موسیٰ رضا (۲۱) ابن موسیٰ کاظم (۲۲) ابن امام جعفر صادق (۲۳) ابن امام محمد باقر (۲۴) ابن امام زین العابدین (۲۵) ابن امام حسینؓ (۲۶) ابن حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ

قیاس یہ ہے کہ حضرت مخدوم شیخ اعظم ثانی سمرقند سے ہجرت کرکے وارد ہندوستان ہوئے۔ بعد میں لکھنؤ آکر مقیم ہوگئے اور یہیں وفات پائی۔

مولانا شاہ تراب علی قلندر کاکوروی (۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء) اپنے جد حضرت ملا عبدالکریم کاکوروی (۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء) کی اولاد کے حال میں رقمطراز ہیں:

"ملا عبدالکریم کی شادی سید محمدی فیاض خلیفہ بندگی نظام الدین امیٹھوی کی بیٹی سے امیٹھی قصبہ میں ہوئی تھی۔ ان بی بی سے دو بیٹیاں اور تین بیٹے پیدا ہوئے۔ پہلی بیٹی

[1] تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ۱۲: ۲۹۹۔ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور [2] باغ بہار مصدرہ سابق۔ کتبخانہ انوریہ۔ کاکوری۔

محمد اشرف ابن شیخ عبدالقادر جو آنجناب کے بھتیجے تھے کو بیاہی گئیں . . . . .

دوسری بیٹی کی شادی دیوہ میں مولوی ابوسعید ابن مولوی محب اللہ جو حضرت مخدوم شیخ اعظم ثانی لکھنوی کی اولاد میں تھے کے ہمراہ ہوئی ۔ ان سے ملا عبدالسلام وغیرہ چار بیٹے پیدا ہوئے ۔ ملا عبدالکریم صاحب نے خود سب کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت فرمائی۔[1]

" ملا عبدالسلام مرحوم مخدوم شیخ عبدالکریم کے شاگرد اور ان کے ساختہ و پرداختہ تھے ۔ شاہ جہاں (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء - ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء) کے عہد میں پہلے لاہور کے مدرسہ میں استاد اور بعد میں شاہی لشکر کے مفتی ہو گئے ۔ اس وقت کے بڑے علماء میں تھے ۔ ان کی تصانیف میں انشراحات معالیہ ہے ۔ قصبہ دیوہ کے حجاجی محلہ میں ایک حویلی میں رہتے تھے ۔ یہ حویلی بعد میں انھوں نے اپنی بیٹی کو دیدی تھی"[2]

درس وافادہ | ملا صاحب موصوف اپنے استاد ملا عبدالسلام لاہوری (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) سے بقیہ علوم کی تکمیل کر کے ان کے نقش ثانی بنے ۔ "مآثر الکرام" کے مولف نے اسکی صراحت اس طرح کی ہے کہ :

چنانچہ اتحاد اسمی متحقق بود نسبت فضیلت نیز مرتبہ مساوات بہم رسانید[3]

ہمنام ہونا تو ثابت ہے ہی بلکہ فضیلت کی نسبت اور مساوات کا مرتبہ بھی ایک ہی تھا ۔

استاد کی وفات کے بعد لاہور میں ان کے قائم کردہ مدرسہ میں ان کی جگہ مدرس

[1] "کشف المتواری فی حال نظام الدین قاری" ص : ۱۲۹ [2] ایضاً ص ۱۳۶ [3] مآثر الکرام ۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی ۱ : ۲۳۶ ۔ ۲۳۵ ۔

بھی رہے یہیں ملا عبدالحلیم سہالوی جد ملا نظام الدین فرنگی محلی (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) ملا دانیال چوراسی اور ملا عبدالقادر فاروقی جیسے مشاہیر ان کے ارشد تلامذہ بنے ۔ ملا صاحب عہد شاہجہانی میں کچھ روز دہلی کے قاضی بھی رہے ۔ اس کے بعد شاہجہاں (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء - ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء) کے مفتی لشکر ہو گئے ۔ "بادشاہ نامہ" کے مولف لکھتے ہیں :

" کچھ دنوں تک انھوں نے طالب علمی کا زمانہ گزارا ، اپنی بیدار بختی کی سعادت سے اپنے کو دربار کے خاقانوں کی ڈیوڑھی تک پہنچایا اور خلق کو پناہ دینے والی درگاہ کے ملازموں کی لڑی میں خود کو شامل کر لیا ۔ کچھ دنوں تک انھوں نے ... کی خدمت انجام دی ۔ اب عمر کی زیادتی کی وجہ سے حواس میں اختلال اور اعصابی سستی آگئی ہے حکم کے مطابق اس کام سے ہاتھ کھینچ لیا ہے ۔ لشکر شاہی میں علوم متداولہ کی تدریس اور بادشاہ سلامت کے لیے دعائے خیر میں وقت گذارتے ہیں"[1]

"عمل صالح" سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ اخیر وقت تک انھوں نے درس وافادہ میں اپنے کو مشغول رکھا۔[2]

صاف گوئی | ملا صاحب اپنے فضل و کمال اور تبحر نیز استغنا کی بنا پر کبھی جلالت شاہی سے مرعوب نہ ہوئے ۔ برسر دربار حق بات کہتے اور اس میں نہ کسی مصلحت کی پروا کرتے اور نہ کسی کی رو رعایت کرتے ۔ "باغ بہار" کے مولف نے اس سلسلہ میں کئی واقعات درج کیے ہیں :

[1] بادشاہ نامہ ۔ عبدالحمید لاہوری ، کلکتہ ۱۸۶۸ء ۲ : ۳۴۴ ۔ ۳۴۳ [2] عمل صالح ۔ محمد صالح کنبو لاہوری ۳ : ۳۹۰

"اپنے زمانہ میں اپنی مثال آپ تھے۔ شاہجہاں ان کی استادی اور علمی تبحر کی بنا پر ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور دربار میں اپنے قریب بٹھاتے تھے۔ اردوئے معلیٰ (لشکر شاہی) کے افتا کی سند بھی ایک طویل عرصہ تک آنجناب موصوف سے متعلق رہی۔ اتفاقاً ایک روز شاہ جہاں قلعہ معلیٰ (دہلی) کی تعمیر ملاحظہ کرنے اسکی فصیل پر آئے تھے۔ ملا صاحب کو بھی وہاں حاضر نہ ہوسکنے کا کوئی معقول عذر نہ ملا۔ (چنانچہ وہ بھی وہاں آئے) دیوار پر چلنے کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے انکے پیر ذرا لڑکھڑا گئے، بادشاہ نے (یہ دیکھ کر) کہا ارے آپ اس قدر موت سے ڈرتے ہیں کہ فصیل پر چل نہیں سکتے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں کیوں نہ ڈروں اس لیے کہ چرخ اگر ہزار سال بھی پھرے تو بھی میرا جیسا پیدا نہ ہوگا اور بادشاہ سلامت جیسے بہت سے پیدا ہو جانے ممکن ہیں۔ بادشاہ نے اس (جسارت و بیباکی) کا برا نہ مانا بلکہ مسکرا دیے۔"

ایک دوسری جگہ ملا صاحب کی جسارت، مزاج کے تیکھے پن اور حق گوئی کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

"شاہ جہاں کے ولی عہد دارا شکوہ نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ بادشاہ سلامت سایۂ الٰہی اور خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ آپ کے مرتبہ و منزلت کو پہچان کر آپ کی تعظیم و تکریم بجا لائے، اس بنا پر حضور عالی کے تمام غلام آداب شاہی سے مطلق رو گردانی نہیں کرتے مگر ملا عبدالسلام جو قرآن و حدیث سے پوری طرح باخبر ہیں، اس امر کی پروا نہیں کرتے حالانکہ وہ [1] اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول الخ (اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اور تم میں جو صاحبان اقتدار (اولی الامر) ہوں ان کی فرمانبرداری کرو) کے معنی و مفہوم خوب جانتے ہیں مگر (پھر بھی) اس پر عمل نہیں کرتے۔ بادشاہ نے فرمایا جب ملا صاحب آئیں تو ان سے اس آیت کے معنی پوچھنا اور (تب) ان کو ملزم ٹھہرانا۔ دارا شکوہ نے جب ملا صاحب دربار میں موجود تھے ان سے اس آیت کے معنی پوچھے ملا صاحب نے جواب دیا کہ ظاہر ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور ان کی جو ان کے جانشین ہوں۔ دارا شکوہ نے (پھر) پوچھا کہ نائبین کا اطلاق کن پر ہوتا ہے۔ ملا صاحب نے جواب دیا کہ ہمارے جیسے (علمائے حق) نائبین رسولؐ ہیں جو مخلوق کو دین حق کی راہ پر چلاتے ہیں۔ اس وجہ سے بادشاہ کے لیے لازم ہے کہ ہماری اطاعت کرے۔ دارا شکوہ خاموش ہوگئے اور شاہ جہاں مسکرا دیے اور کہا بیٹا! ملا صاحب کا جواب سن لیا، اس گفتگو سے ملا صاحب کی شخصیت و مزاج کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔"

"طبقات شاہجہانی" سے بھی جو ملا صاحب موصوف کی حیات میں مرتب کی گئی یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہ جہاں نے ان کو اردوئے معلیٰ کے افتا کی خدمت تفویض کی تھی۔ دہلی کے قیام کے دوران انھوں نے حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ (۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء) کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ان سے فیوض و برکات حاصل کیے۔

ملا صاحب کو نہ بحث و مناظرہ کی عادت تھی اور نہ وہ فروعات میں پڑتے تھے۔ طبقات شاہجہانی[1] کے مولف لکھتے ہیں:-

---

[1] طبقات شاہجہانی، ان آٹھ سو اکہتر مشاہیر کا ایک اہم تذکرہ ہے جو تیمور اور اس کے جانشینوں کے عہد میں گزرے ہیں۔ اس کے مولف محمد صادق ہمدانی ہیں جنھوں نے ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء میں اس کو مرتب کر کے شاہ جہاں (م ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء) کو معنون کیا تھا۔

"ہندوستان کے مشہور علماء و دانشوروں میں سے ہیں فقہ، اصول فقہ اور معانی و بیان میں ایک عجیب ملکہ رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے اصول فقہ میں کوئی کتاب لکھی ہے جو تلویح کی ہم پایہ ہے، وہ بادشاہ سلامت کے پاس حاضر ہوئے آنجناب کو ان کا طریقہ پسند آیا چنانچہ لشکر شاہی کے مفتی کی خدمت سپرد فرمائی .... مزاج درویشانہ ہے، طالب علموں کی طرح بحث و مباحثہ سے سروکار نہیں رکھتے۔ جب تحصیل علم سے فارغ ہوئے تو چند روز قطب وقت حضرت خواجہ محمد باقی کی خدمت میں رہے۔ یہ معنی ان ہی کی صحبت کی برکت سے حاصل کیے۔ ان کی عمر دراز ہو"[1]

وفات | ملا صاحب موصوف کی ولادت و وفات کے سنین اب تک متحقق نہ ہوسکے۔ وفات کے سنہ میں کافی اختلاف ہے۔

"عمل صالح": مولفہ محمد صالح کنبو لاہوری کا سن تکمیل (۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء)[2] ہے۔ اس کے مولف لکھتے ہیں:

آخر کار در وقت موعود رخت ہستی بر بست[3]   بالآخر وقت مقررہ پر زندگی کے سامان کو لپیٹ دیا (وفات پائی)

عم محترم مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی مرحوم و مغفور نے اپنے مقالہ[4] "ملا قطب الدین شہید" میں مولانا محمد نعیم فرنگی محلی (۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء) کی بیاض کے حوالہ سے لکھا کہ "ملا عبدالسلام دیوی کا سال وفات افضل العلماء سے نکلتا ہے (۱۰۸۲ھ/۱۶۷۱ء) اور دوسرا مادۂ تاریخ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل ہے۔ رسالہ قطبیہ اور دو ایک تذکروں میں ۱۰۴۲ھ/۳۳-۱۶۳۲ء ہے۔

۱؎ طبقات شاہجہانی۔ محمد صادق ہمدانی۔ ۲۲۷ فارسیہ اخبار یونیورسٹی کلکشن۔ علی گڑھ ص ۶۱۷ ۲؎ ملاحظہ ہو MUGHALS IN INDIA BY D.N. MARSHAL ۳؎ عمل صالح جلد ۳ ص ۳۷۹ ۴؎ ذکر و فکر۔ دہلی۔ جلد ۸ شمارہ ۱۔

راقم السطور کی نظر میں دونوں سنین محل نظر ہیں۔ "عمل صالح" کی تکمیل (۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء) کے وقت ملا صاحب موصوف کی وفات ہوچکی تھی۔ ۱۰۴۲ھ/۳۳-۱۶۳۲ء بھی اس لیے درست نہیں ہے کہ اس کے تقریباً ۴ سال بعد جب "طبقات شاہجہانی" مرتب کی گئی تو اس میں ان کی درازیٔ عمر کی یوں دعا کی گئی (ان کی عمر دراز ہو[1])۔ مزید برآں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ذخیرۂ فرنگی محل میں موجود "ہدایہ اخیرین" پر ترقیمہ سے اس بات کی توثیق ہوجاتی ہے کہ وہ ۱۰۵۰ھ/۴۱-۱۶۴۰ء میں نہ صرف بہ قید حیات تھے بلکہ درس بھی دیتے تھے۔ ملا نظام الدین فرنگی محلی (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کے دادا ملا عبدالحلیم سہالوی لکھتے ہیں:

"کتاب ہدایہ کا نصف آخر عبد ضعیف اپنے غنی و بزرگ و برتر رب کی رحمت کا محتاج عبدالحلیم بن عبدالکریم انصاری سہالوی کے ہاتھوں تمام ہوا (ہدایہ کی نقل) کے پڑھنے کا سلسلہ بھی علمائے عصر کے ان استاد کی خدمت میں ہوتا رہا جو زمانہ کے فقہا کے مرجع و ماوی معقولات و منقولات خصوصاً فقہ و اصول فقہ میں اکابر فضلاء کی حجت حضرت شیخ عبدالسلام الاعظمی ہیں۔ سہ شنبہ ۱۸ رمضان المبارک ۱۰۵۰ھ بوقت عصر بہ مقام پایۂ تخت لاہور۔

میں نے یہ کتاب اس وجہ سے لکھی تاکہ یہ قیامت کے روز میرے گناہوں کی سفارش کرے، بندہ کے جسم کی فنا کا تو علم ہے کہ وہ فنا ہوجائے گا مگر دنیا میں اس کی یہ تحریر بطور نشانی رہ جائے گی۔"

خلاصہ یہ ہے کہ ملا عبدالسلام دیوی شاہ جہاں کے عہد (۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء)

۱؎ طبقات شاہجہانی ص ۶۱۷۔

تک بقید حیات تھے۔ عمل صالح کی تکمیل (۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء) کے وقت ان کی وفات ہو چکی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی وفات انہی دو برسوں میں کسی سال میں ہوئی۔ ان کا مزار قصبہ دیوہ ضلع بارہ بنکی میں ہے۔

خاندان | ملا صاحب موصوف کے چار بھائی تھے۔ ایک بھائی لاولد فوت ہوئے اور دو بھائیوں سراج الدین و محمد یٰسین نے غیر کفو میں شادیاں کرلیں جس کی وجہ سے ملا صاحب نے اپنے بیٹوں اور بیٹی کی شادیاں ان کی اولادوں (بھتیجوں و بھتیجیوں) کے ساتھ نہ کیں۔ چنانچہ اپنی ایک بیٹی کی شادی بھی کاکوری ہی میں خاندان میں کی۔[2] خود ملا صاحب کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

۱۔ ملا ضیاء الدین ۲۔ ملا عبدالوالی ۳۔ ملا عبدالباقی ۴۔ ملا ابوالمعالی[3]

اول الذکر تینوں بیٹوں سے اولادیں ہوئیں جنھوں نے فضل و کمال میں شہرت حاصل کی۔ مولانا نور الہدیٰ، ملا نظام الدین احمد، ملا سید عبدالحفیظ، حضرت شاہ ابوالمنعم قادری گنج المعرفت صاحب ولایت قصبہ دیوہ، مولانا ذوالفقار علی، مولانا برہان الدین، ملا عبدالباقی شارح مثنوی مولانا روم موسومہ بہ کشف مثنوی معنوی اور ملا عبدالصمد مفسر صاحبان جیسے بکثرت مشاہیر ان کے اخلاف کی صف میں نظر آتے ہیں۔ ان کے چاروں صاحبزادگان علم و فضل میں اپنے والد کے نقش ثانی تھے۔ ملا ابوالمعالی اپنے والد کے سامنے لاولد فوت ہوئے۔ ملا صاحب موصوف نے بیٹے کے دوران درس ان کے واسطے

---

[1] باغ بہار۔ مصدر سابق [2] یہ بیٹی شیخ سیف الدین نبیرۂ حضرت مخدوم ملا عبدالکریم علوی کی بیوی تھیں۔ [3] ایضاً [4] مزید تفصیلات اور خاندانی شجرہ کے لیے "نفحات النسیم فی تحقیق احوال اولاد ملا عبدالکریم" مولفہ منشی امیر احمد علوی کاکوروی (ڈپٹی کلکٹر) ملاحظہ ہو۔

"الانشراحات المعالیہ" تصنیف فرمائی۔ چنانچہ وہ "انشراحات معالیہ" میں رقمطراز ہیں:

"ولما کان الداعی الی ھذا التحریر الولد المغفور المبرور ابوالمعالی وکان التحریر مفید الانشراح خاطرہ سمیتہ بالانشراحات المعالیۃ"

اس کا ایک عمدہ نسخہ کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری میں بھی محفوظ ہے۔

تصانیف | راقم کے علم میں ملا صاحب موصوف کی دو تصانیف موجود ہیں۔ ۱۔ انشراحات المعالیہ ۲۔ شرح تہذیب المنطق والکلام۔

۱۔ الانشراحات المعالیہ: "المنار" اصول فقہ کا مشہور متن ہے۔ اس کے مصنف امام ابوالبرکات عبداللہ بن احمد معروف بہ حافظ الدین نسفی (۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء) ہیں۔ مصنف نے بھی اپنے اس عمدہ متن کی شرح "کشف الاسرار" کے نام سے کی تھی۔ ہندوستان میں منار کی سب سے پہلی شرح غالباً مولانا سید یوسف بن جمال حسینی، مدرس مدرسہ فیروز شاہی کی توجیہ الافکار ہے۔ پھر تو بہ بکثرت علماء و فضلاء نے اس متن کی شرح اپنے اپنے انداز میں کی ان میں سعد الدین ابوالفضائل دہلوی (۸۹۱ھ/۱۴۸۶ء) کی "افاضۃ الانوار فی اضاءۃ اصول المنار"، ناصر الدین ابن الربوۃ دمشقی (۷۶۴ھ/۱۳۶۳ء) کی "قدس الاسرار"، شیخ شجاع الدین ہبۃ اللہ ترکستانی (۷۳۳ھ/۳۲-۱۳۳۳ء) کی تبصرۃ الاسرار فی شرح المنار"، شیخ جمال الدین یوسف کی "اقتباس الانوار" اور جلال الدین ابن احمد رومی فقیہ حنفی (۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء) کی شرح ہیں۔ ہندوستان میں ملا احمد جیون امیٹھوی (۱۱۳۰ھ/۱۷۱۸ء) کی شرح نور الانوار درس نظامی میں داخل رہی ہے۔ ملا نظام الدین فرنگی محلی (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) نے "الصبح الصادق" کے نام سے اسکی شرح لکھی ہے۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو راقم السطور کی کتاب "عربی ادب میں اودھ کا حصہ" ص ۹۵۔

"الاشراحات المعالیہ" یا "شرح علی المنار" کے دو نسخوں کا علم ابھی تک راقم کو ہوا ہے۔ اول الذکر نسخہ کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری میں محفوظ ہے اور دوسرا نسخہ خدابخش لائبریری پٹنہ کے ذخیرہ مخطوطات (ایچ۔ایل ۲۴۷) میں موجود ہے۔ موخرالذکر نسخہ ناقص الاول ہے۔ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کا نسخہ مکمل ہے یہ متوسط تقطیع میں پانچسو آٹھ صفحات پر مشتمل بخط نستعلیق و خفی ہے۔ حمد و ثنا کے بعد اس کی ابتدا اس طرح ہے:

"الحمد للہ الذی دل علی وجودہ بتکوین المخلوقات مع خطاب کن القدیم وخص من بینھا الانسان بالدلالۃ علیہ بافعالہ واقوالہ بلطفہ العمیم حتی صار مثل نور اللہ فی اظہار احوال العلویات والسفلیات والجسمانیات والروحانیات" الخ

بعد ازاں منازل الاصول کی شرح کے سلسلہ میں تمہیدی کلمات کے بعد ان سطور کو لکھنے کے داعی یعنی اپنے مرحوم بیٹے ابوالمعالی کا تذکرہ کیا ہے۔ کتاب پر جا بجا مفید حواشی ہیں اور منار کی مختصر عبارتوں کو لکھنے کے بعد انکی تفصیل و تشریح اور تفسیر کی ہے۔ دونوں نسخوں پر ترقیمہ کی عبارت میں سن کتابت درج نہیں ہے۔

خدابخش لائبریری کے نسخے کا خط کافی جلی ہے اس کی ابتدا اس طرح ہے:

"اعلم ان اللہ سبحانہ وتعالی صفات ثمانیۃ قدیمۃ الحیوۃ والقدرۃ والارادۃ والسمع والبصر والعلم والکلام والتکوین اثبتہ قوم من علماء ماوراء النھر وفی بعض الکتب اثبتہ الحنیفہ وھی لیست عین الذات ولا غیرھا" الخ

۲۔ شرح تہذیب المنطق والکلام۔ علامہ سعدالدین مسعود بن عمر تفتازانی (۷۹۲ھ/۱۳۹۱ء)

نے ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء میں اپنے بیٹے کے واسطے منطق و کلام میں ایک اہم متن "تہذیب المنطق والکلام" کے نام سے مرتب کرکے دو اقسام پر منقسم کیا۔ ان کی اس تصنیف کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور وہ مدرسین کے حلقۂ درس میں داخل ہوگئی۔ علامہ جلال الدین محمد بن اسعد صدیقی دوانی (۹۰۷ھ/۱۵۰۱ء) نے اس کی شرح لکھی جو باوجود ناتمام رہ جانے کے بہت مشہور و متداول ہوئی پھر امیر ابوالفتح سعیدی (۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء) نے اس پر ایک حاشیہ لکھا اور دوانی کے کام پر تکملہ کیا۔ شیخ مصلح الدین لاری (۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء) نے بھی اس پر ایک حاشیہ لکھا تھا۔ فاضل حسین خلخالی (۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء) بھی اس کے محشیوں میں ہیں۔ تہذیب کی شروح میں شیخ الاسلام احمد بن محمد (۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء) کی شرح التہذیب، زین الدین عبدالرحمن بن ابی بکر معروف بہ عینی (۸۹۳ھ/۱۴۸۸ء) کی جہد المقل اور مظفر الدین علی بن محمد شیرازی (۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء) نیز ملا عبداللہ یزدی کی شروح مشہور ہیں۔

ملا عبدالسلامؒ نے اسی تہذیب المنطق والکلام کی شرح اپنے انداز میں کی۔ راقم احقر کی نظر سے اس کا صرف ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ لائبریری کے ذخیرہ حبیب گنج ۱۸/۴۸ میں گزرا ہے یہ نسخہ ۱۰۰ اوراق پر مشتمل خط نستعلیق میں متوسط تقطیع پر ہے۔ ابتدا میں وجہ تالیف وغیرہ کا بیان نہیں ہے بلکہ براہ راست بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد تہذیب المنطق کی عبارتیں لکھ لکھ کر تشریح و تفسیر کی ہے اور اس ضمن میں متقدمین کے اقوال بھی بعض جگہ درج کیے ہیں۔

مذکورہ بالا نسخوں کی طرح اس میں بھی ترقیمہ کی عبارت میں کسی سن کتابت یا سن تصنیف کا پتہ نہیں چلتا ہے البتہ خاتمہ پر اسقدر عبارت درج ہے:

"اللھم اجعلنا علیین بالاسم معرضین عن الفضول بالقول من العمل واعصمنا من الخطاء والخطل تمت شرح التھذیب صنفہ الحبر الکامل عبدالسلام الدیوی الاعظمی یوم الجمعۃ قبل صلوتھا۔ فالحمد للہ اولہ وآخرہ۔"

ہندوستان کی فارسی شاعری میں آزادی کے بعد توصیف دیوتاں

از ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط داروہ

ادیان اور مذاہب کی ترویج و تبلیغ اور توسیع و ترقی میں زبان و ادب کا حصہ بہت اہم رہا ہے۔ حامیانِ مذہب نے انہیں بطور وسیلے کے استعمال کیا ہے۔ اردو زبان کے ساتھ ہی ہند میں فارسی نے بھی اس فریضہ کو ادا کرنے میں اہم خدمات پیش کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں مروجہ مذاہب اور ان کے مختلف فرقوں کی تعلیمات پر مشتمل اعلیٰ مذہبی ادب فارسی کتابوں میں جگہ پا چکا ہے۔ فارسی ادب کے نثر و نظم ہر دو اصناف میں اسکی وافر مقدار موجود ہے۔

سنسکرت کی طرح فارسی زبان کسی دور میں بھی عوامی زبان نہیں رہی لیکن سنسکرت ہی کی طرح اسے بھی شاہی محافظت نصیب ہوتی رہی اور امورِ سلطنت میں اس کے استعمال کو فوقیت دی گئی، شاہی فرامین فارسی میں لکھے گئے۔ گویا دورِ وسطیٰ کے ہندوستان میں درباری زبان فارسی ہی رہی تھی۔ بنا بر ایں عوام کے تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص ادبا و شعرا نے اپنی نگارشات کو پیش کرنے کے لیے اسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا تھا۔ لیکن عنانِ حکومت جب انگریزوں کے ہاتھوں میں منتقل ہوئی تو بجائے فارسی کے اردو کا استعمال ہونے لگا اور آزادی کے بعد اردو کی جگہ ہندی نے لے لی۔ اس طرح فارسی اور اردو شاہی سرپرستی سے محروم ہوتی چلی گئیں اور جب آزادی کے بعد اردو ہی کس مپرسی کے عالم میں ہو گئی تو فارسی کی کیا بساط۔

لیکن دراصل زبان اپنی اثر آفرینی کی بدولت زندہ رہتی ہے۔ فارسی بھی اپنی صفت کی وجہ سے ایسی "منہ لگی" تھی کہ ہمارے ادبا و شعرا نے غربت میں بھی اس سے نباہ کیا اور اپنی قلمی کاوشیں فارسی میں پیش کرتے رہے۔ اتنا ہی نہیں آزادی کے بعد "سبھیتا" اور "سنسکرتی" کی بنیاد پر بعض جیالوں نے "ودیشی" بھاشا (فارسی)، میں اپنے دیوتاؤں کی توصیف و ثنا کے ترانے گائے ہیں۔

یہ سخت جان لیکن نرم و نازک اندام فارسی زبان اپنی شیریں بیانی کی وجہ سے آج بھی پسند کی جاتی ہے۔ اس کے چاہنے والوں میں ہندو مسلم کی تفریق و تخصیص نہیں اور نہ ان میں لسانی تعصب اور مذہبی عناد ہے، اسی لیے تو حمد و نعت کے ساتھ ہی دیوتاؤں کی توصیف و ستائش کے نغمے بھی فارسی میں ملتے ہیں۔ کرشن کی بانسری، شنکر کے ڈمرو اور سرسوتی کے ستار کی دھنوں سے معمور فارسی شاعری میں مہا کالی کی تلوار کی جھنکار اور رام کے تیروں کی شناشن کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ اسی لیے تو فرقہ بندی کے ماحول میں یہ رام۔ رحیم کی دوئی مٹا کر یگانگت پیدا کرنے والی اور امن و آشتی کا رس کانوں میں گھولنے والی فارسی ہمیشہ سے اتحاد و یکجہتی کی خوگر رہی ہے ؎

تو برائے وصل کردن آمدی   نے برائے فصل کردن آمدی

جناب رام لعل نابھوی نے اس سلسلے میں ایک بہت ہی وقیع کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ عربی۔ فارسی۔ اردو میں ہندوؤں کی خدمات اور ان کے تہذیبی اثرات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اس موضوع پر "معارف" اعظم گڈھ میں ان کے مضامین کا سلسلہ بھی شروع ہوا ہے۔ اپنے ایک خط مطبوعہ "ہماری زبان" دہلی میں وہ رقمطراز ہیں:

"خانۂ[1] بک سیلرز.... کی تازہ فہرست کتب میں جو سنسکرت کتب کے فارسی تراجم ملتے ہیں ان میں اقبال یغمائی کی مختصر رامائن۔ یغمائی ہی کی مکمل دو جلدوں میں مہابھارت، چار جلدوں میں یوگ واشسٹ اور اپنشد وغیرہ درج ہیں۔ اکیلے مہابھارت کی قیمت ۹۵۰ر ہے۔ یہ تو وہ کام ہے جس کا پتہ لگ گیا ہے، اللہ جانے اور کیا ہو رہا ہے اور کہاں ہو رہا ہے"

• انھوں نے عارف نوشاہی ایڈیٹر "دانش" اسلام آباد (پاکستان) کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"پاکستان میں اس موقع پر ذخیرے دستیاب ہوئے ہیں، اس کا ثبوت ہے وہ ضخیم ۱۵ جلدیں جن میں فہرست مخطوطات فارسی درج ہیں"[2]

بہرحال! فارسی زبان میں ہند و پاک میں آزادی کے بعد بھی ادبی کام ہو رہا ہے۔ اردو کے بعد بھی اک زبان ایسی ہے جس کے ادب میں "اتحاد و اتفاق" کی فضا ہموار کی جا رہی ہے۔ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ اس میں "رحیم" کے ساتھ "رام" کو بھی یاد کیا جا رہا ہے اور پیغمبروں کے ساتھ دیوی۔ دیوتاؤں کی ستائش کے نغمے الاپے گئے ہیں۔ چنانچہ ہندوؤں کے معبود اعلیٰ شیوجی کی توصیف میں مسلم شاعر عبدالرحمٰن بن عبدالرسول چشتی کی مندرجۂ ذیل کتابیں مخطوطات کی شکل میں ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں موجود ہیں۔

(۱) شری مہادیو کا ارشاد پاروتی کے نام (۲) شری مہادیو کا ارشاد شری کرشن کے نام (۳) کشف الانوار وغیرہ۔

• مذکورہ بالا سارے مخطوطات فارسی میں ہیں اور صرف ایک ادیب کے تحریر کردہ

---

[1] غالباً خانہ ہے، مکتوب نگار نے بمبئی کے متعلق لکھا ہے [2] ہماری زبان دہلی یکم نومبر ۱۹۹۰ء۔

ہیں۔ ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں اور بھی مخطوطات و کتابیں ہوں گی جن میں خاصتاً دیوی۔ دیوتاؤں کی معلومات یا ان کی ستائش و توصیف کی گئی ہو اور یہ عمل آزادی کے بعد بھی جاری رہا۔ چنانچہ ذیل کی نظم میرے خیال پر دال ہے۔ اس نظم میں "مہادیو" (معبود اعلیٰ) کی بڑائی بیان ہوئی ہے۔

اے مہیش از بسکہ عاصی و گنہگاریم ما　　مستحق لطف و بخشش را سزاواریم ما

اے شری گنگا بفرقت مغفرت بخش جہاں　　مار در گردن کہ قلبش رام سے گردد عیاں

بر جبین نور افشاں ماہتابی چوں کماں　　جسم پاکت ہمچو آتش زیر خاکستر نہاں

مشول در دست مبارک جعد بہ بالائے سر　　زہر داری در گلو مسند ز چرم شیر نر

جسم انور در ضیا رغیرت دہ شمس و قمر　　نام شیو شنکر کند در کام جان کار شکر

پنج رخ، سہ چشم داری با ہمہ با زیب گلو　　با اما ام زمانہ در نشستہ رو بہ رو

ہیبت در دیشی و سلطانِ شاہان ست شیو　　صد ہزاراں تاج بر جعد تو قربان ست شیو

جملہ عالم تن بود تو اندر آں جان ست شیو　　فیض و علم تو ہمہ بخشش و ہمہ دان ست شیو

بر فلک بر ہما بجانِ دل شدہ جویان تو　　ہم جنابِ وشنو در زیر زمیں خواہان تو[1]

اشعار کا مطلب یہ ہے کہ اے مہیش! ہم بہت گنہگار ہیں۔ آپ کی بخشش اور مہربانی کے ہم حقدار ہیں۔ اے شیو! مقدس گنگا آپ کے سر پر ہے، جس میں نہانے سے مغفرت ہو جاتی ہے۔ آپ کی گردن میں سانپ حمائل ہیں اور آپ کے دل میں "رام" کا ذکر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ آپ کی پیشانی پر ہلال چمکتا ہے اور آپ کا جسم انگارے کی طرح راکھ کے نیچے چھپا ہے۔ آپ کے دستِ مبارک میں ترشول (نیزہ) ہے اور سر پر جٹائیں

---

[1] چھر و رام: شیو استوتر (शिव स्तोत्र) مشمولہ "شکتی" دہلی مارچ ۱۹۸۵ء۔

(لمبے بال) ہیں، آپ کے گلے میں زہر ہے اور پوستین، شیر نر آپ کا مسند ہے۔ آپ کے جسم کا نور چاند اور سورج سے بڑھ کر ہے۔ آپ کا نام شیو شنکر ہے جو روحانی چین کے لیے شیرینی کا کام کرتا ہے۔

آپ کے پانچ منہ، تین آنکھیں اور گلے میں کاسۂ سر کی مالا ہے۔ جگ مہا اما آپ کے روبرو بیٹھی ہیں۔ آپ صورت سے درویش دکھائی دینے کے باوجود شاہوں کے سلطان ہیں۔ آپ کی جٹاؤں پر ہزاروں تاج قربان۔ ساری کائنات اگر جسم کی مانند ہو تو آپ اس میں جان (روح) ہیں۔ آپ علوم و فیوض کی بخشش کرنے والے ہر ایک راز سے واقف ہیں۔ برہما آسمان پر اور وشنو زیرِ زمیں (تحت الثریٰ) آپ کے متلاشی اور خواہاں ہیں۔

برادرانِ وطن کے یہاں شیوجی کو شنکر، مہیش (معبودِ اعلیٰ)، شیو (مبارک)، بھیم (طاقتور)، ترلوچن (سہ چشمی)، بھیرو (بھیانک)، نیل کنٹھ (نیلے گلے والا)، مہادیو (معبودِ اکبر) بھولے ناتھ (سادہ لوح والی) وغیرہ کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ ان کے ماننے والے "شیو" کہلاتے ہیں۔ شنکر جی اگرچہ "بھولے ناتھ" ہیں لیکن تخریبی قوت کے دیوتا بھی یہی ہیں۔ رگ وید کے "رودر" دیوتا شنکر کے پیش رو مانے جاتے ہیں۔ بھیرو کی شکل میں شنکر کے گلے میں کاسۂ سر کی مالا، ہاتھ میں ترشول، گلے میں لپٹا ہوا سانپ، پیشانی پر ہلال اور شیر کے چمڑے کی تہہ بند میں ڈمرو کی تال پر نہایت غضبناک حالت میں ناچتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ شنکر کو جلالی روپ میں "نٹ راج" کہا جاتا ہے۔ رقص کا یہ عمل ہندوؤں کے نزدیک کائنات کی حرکت (COSMIC RHYTHEM) کی طرف اشارہ ہے۔

ہندوؤں کے تین معبودانِ اعظم برہما، وشنو اور مہیش بالترتیب تخلیق، تنظیم اور

تخریب کے دیوتا سمجھے جاتے ہیں۔ چونکہ برہما نے کائنات کی تخلیق مکمل کر لی ہے، اب ان کے ذمہ کوئی کام نہیں۔ شاید اسی لیے ان کی باقاعدہ پوجا پاٹ کرنے کے لیے کوئی مندر بھی نہیں ہے۔ پورے ہندوستان میں صرف اجمیر کے قریب پشکر نامی گاؤں میں برہما کا ایک مندر ہے لیکن مقامی شیو مندروں کے درمیان اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ وشنو نے دنیا کے نظم و نسق اور بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے ابھی تک نو بار مختلف شکلوں میں روئے زمین پر نزول کیا ہے اور پرلیہ (قیامت) سے قبل "نویں اوتار" (گوتم بدھ) کے تخمیناً ۴۲۵... (سوا چار لاکھ سال) بعد روئے زمین پر آخری بار کالکی کی شکل میں نزول کریں گے۔ ابھی تک وشنو نے (۱) متسیہ اوتار (مچھلی کی صورت میں) (۲) کورم اوتار (بصورت کچھوا) (۳) وراہ اوتار (بصورت سور) (۴) نرسنگھ اوتار (آدمی اور شیر کی مرکب شکل میں) (۵) وامن اوتار (بصورت بونا) (۶) پرشورام اوتار (بشکل شجیع) (۷) رام اوتار (۸) کرشن اوتار اور (۹) بدھ اوتار (بصورت گوتم) وغیرہ روپ لے کر زمین پر نزول کیا ہے۔ ایسا ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔

وشنو کا ذکر ویدوں میں بھی آیا ہے اور "معبودِ شمس" کی صورت میں اس کی پرستش کی جاتی رہی ہے۔ تصویر میں وشنو کے چار ہاتھ دکھائے جاتے ہیں۔ پہلے میں شنکھ، دوسرے میں گدا (گرز)، تیسرے میں چکر اور چوتھے میں کمل (کنول) کا پھول ہوتا ہے۔ اس کی بیوی لکشمی اور بحرِ ظلمات (شیر ساگر) میں اننت ناگ (کشتی کی شکل میں) ان کا مسند ہے۔ ان کی ناف سے اُگے ہوئے کنول کے پھول پر برہما کو مسند نشین دکھایا جاتا ہے۔ وشنو ہندوؤں کے یہاں رحیم و شفیق دیوتا ہیں اور رام و کرشن کی شکل میں وہ کم و بیش سارے ہندوستان میں پوجے جاتے ہیں۔ رام کا پیدائشی مقام اجودھیا اور کرشن کا

متھرا سے قریب گوکل مانا جاتا ہے۔ رام کے واقعات رامائن میں درج ہیں جو سنسکرت میں والمیکی اور ہندی میں تلسی داس نے لکھی ہے۔ کرشن کے واقعات مہابھارت میں درج ہیں اس کا ایک جزو "گیتا" کہلاتا ہے جو کرشن کی تعلیمات پر مشتمل ہندوؤں کی مقدس کتاب ہے۔ گیتا کے کئی منثور و منظوم تراجم دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہوئے ہیں۔

فارسی میں فیضی کی ترجمۂ بھگوت گیتائے منظوم، مراۃ الحقائق از عبدالرحمن چشتی، ترجمۂ گیتا از کنور بدری کرشن فروغ۔ ان کے علاوہ کرشن کی تعریف و توصیف میں کئی منظوم و منثور تصانیف کا سراغ ملتا ہے۔ رام چندر جی کی زندگی پر بھی فارسی میں کتابیں دستیاب ہیں اور فارسی میں رامائن کے ترجمہ کا ذکر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ رسالۂ اطوار گفتگوئے بشسشت رشی و شری رام چندر جی) از عبدالرحمن، ترجمۂ والمیکی رامائن از ملا عبدالقادر بدایونی، شیخ سعداللہ کی مثنوی "رام وسیتا" گودھر داس کی "مثنوی رامائن، چندر من بیدل کا ئستھ کا منظوم و منثور ترجمۂ رامائن، امر سنگھ کا "امر پرکاش" وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔ امانت رائے لال پوری، مصر رام داس قابل، جگل کشور حسن فیروز آبادی، منشی ہرلال رسوا، مکھن لال ظفر وغیرہم نے بھی رامائن کے تراجم اور واقعات رام پر قلم اٹھا کر فارسی ادب میں ہندو مذہب پر اچھا مواد فراہم کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں آزادی کے بعد بھی رام و کرشن کی مدح سرائی میں فارسی ادب وجود میں آرہا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ذیل میں آزادی کے بعد کرشن کی مدح سرائی میں لکھی گئیں چند فارسی نظموں پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

ہندوؤں کے نزدیک کرشن، وشنو کے آٹھویں اوتار ہیں۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ متھرا کے راجہ کونس کو نجومیوں نے بتایا تھا کہ دیوکی کا آٹھواں بچہ تیری سلطنت

کو چھین کر تجھے ختم کر دے گا۔ چنانچہ اس نے اپنی چچا زاد بہن دیوکی اور اس کے شوہر وسودیو کو قید خانے میں ڈال دیا۔ انہیں جب بھی کوئی اولاد پیدا ہوتی کونس بلا کسی تحقیق و مروت کے اسے مروا دیتا۔ اس طرح اس نے دیوکی کے سات بچوں کو مروا ڈالا۔ اسے جب پتہ چلا کہ آٹھواں بچہ پیدا ہونے والا ہے تو اس نے قید کے بندوبست میں مزید اضافہ کر دیا۔ وقت معینہ سے پہلے دیوکی کا آٹھواں بچہ پیدا ہوا تو وسودیو نے اس طوفانی بارش کی رات میں اس نوزائیدہ کو ایک ٹوکری میں رکھ کر نہایت خاموشی کے ساتھ جمنا ندی کے دوسرے کنارے آباد گوکل میں یشودھا نامی عورت کے یہاں چھوڑ آیا اور اسی رات جنمی یشودھا کی لڑکی کو قید خانے میں لے آیا۔ صبح جب کونس کو بچہ پیدا ہونے کی اطلاع ملی تو وہ دیوانہ وار دوڑتا ہوا قید خانے پہنچا اور اس نوزائیدہ کو دیوکی کی گود سے چھین کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ زمین پر گرتے ہی نور کی شکل میں آسمان پر چلی گئی اور اسے بد دعا دی کہ تیرا دشمن تو پیدا ہو گیا ہے وہ جب تجھے مار ڈالے گا تو میں اس وقت زمین پر اتر کر تیرا خون پیونگی۔ یہ سن کر کونس بہت زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔

گوکل میں یشودھا اس بچے کو پالنے لگی۔ وہ بچہ بچپن ہی سے غیر معمولی ذہانت رکھتا تھا۔ جتنا وہ ہوشیار اور چالاک تھا اتنا ہی نٹ کھٹ بھی۔ اس کی شرارتوں سے گوالنیں تنگ آگئی تھیں۔ اس لیے بار بار یشودھا سے شکایتیں کرتیں۔ گوالنوں کے گھروں میں گھس کر دہی۔ دودھ چرا کر کھانا اس کا معمول تھا۔

وقت گذرتا گیا اور کرشن نے بچپن سے جوانی میں قدم رکھا۔ بانسری بجانا اس کا مشغلہ تھا۔ اب کرشن کی چھیڑ چھاڑ کی نوعیت بھی بدل گئی تھی۔ وہ جمنا پر نہانے والیوں کو ستاتا۔ ان کے کپڑے چرا کر اپنے پاس رکھ لیتا۔ ایسی شرارتوں سے تنگ آنے کے باوجود

ان عورتوں کے دلوں میں کرشن کی محبت برابر پروان چڑھتی رہی۔ اسی دور میں کرشن نے جمنا میں رہنے والے ایک خطرناک اژدھے کو مار کر گوکل والوں کو اس سے نجات دلائی تھی۔ طوفانی بارش میں اس نے ان کی مدد کی۔ رفتہ رفتہ عوام میں کرشن مقبول ہوتے گئے اور پھر انہیں وشنو کا اوتار مان لیا گیا۔ رادھا نامی گوپن کرشن پر عاشق ہوگئی تھی۔ کرشن لیلاؤں سے متعلق کتابوں میں ان کی عشقیہ وارداتوں کو نہایت موثر اور ہیجان انگیز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ بہرکیف! کرشن بالآخر کونس کا خاتمہ کر دیتے ہیں اور خود متھرا کے راجہ بن جاتے ہیں۔ بعد میں وہ علاقہ گجرات میں دوارکا نامی شہر بساتے ہیں اور اسے اپنا دار السلطنت بنا لیتے ہیں۔

اسی اثناء میں کرشن کے پھوپھی زاد بھائیوں کورو اور پانڈو میں حکومت کے لیے جنگ چھڑ جاتی ہے تو کرشن پانڈوں کی مدد کرتے ہیں۔ یہ لڑائی ہندوستان کی نیم تاریخی و مذہبی روایت میں "مہابھارت" کے نام سے مشہور ہے۔ عین لڑائی کے وقت پانڈو کے بھائی ارجن کو میدان کارزار میں کرشن نے جو تلقین کی تھی وہ گیتا میں موجود ہے جو "مہابھارت" نامی کتاب ہی کا ایک جزو اور ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ گھمسان کی لڑائی میں بالآخر پانڈو فتح یاب ہوتے ہیں اور کوروؤں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لڑائی کے بعد کرشن جنگل کی سمت نکل جاتے ہیں جہاں شکاری کے تیر سے ان کا پیر زخمی ہو جاتا ہے اور یہی زخم انکی زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

کرشن کی اس مہتم بالشان شخصیت کو وشنو اوتار سمجھ کر برادران وطن ان کی پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ وہ آج ہندوؤں کے نہایت اہم دیوتا مانے جاتے ہیں۔ انکی تعریف و توصیف میں فارسی میں کئی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ آزادی کے پہلے بھی اور آزادی کے بعد

بھی۔ دیکھئے! ایک عقیدتمند شاعر کرشن لیلاؤں میں مست ہو کر نہایت وارفتگی کے عالم میں انکی ثنا یوں بیان کرتا ہے:-

جلوہ ہائے کرشن مضمون دقیق / در زبان فارسی تحریر کن
گر بیان کرشن داری مدعا / داستان کرشن پر تنویر کن
سخت گیر ایں سلسلۂ عشق را / دل را یکسر حلقۂ زنجیر کن
خاک کوئے عاشقاں بر سر بنہ / تا رسی با منزلت تدبیر کن
محرم اسرار باشد عاشقے / تو قلوب عاشقاں تسخیر کن
تو چہ دانی راہ و رسم عشق را / تو نہ ایں را ہم چنیں تنکیر کن
ذکر نام پاک کن لیل و نہار / فکر او در دل ہمیں تقریر کن
آں رخ زیبائے کرشن بے مثال / تو ہمیں خاطر نشاں تصویر کن
تا ترا قرب صنم حاصل شود / اے صفی صبح و مسا تدبیر کن[1]

گیتا میں کرشن کی تلقین اور پورے "مہابھارت" میں ان کے کارہائے نمایاں سے ان کی شخصیت ایک مدبر و منتظم کی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے علی الرغم کرشن۔ لیلاؤں کے بیان میں جو کتابیں سپرد قلم کی گئی ہیں وہ نہایت عامیانہ ہیں اور ان میں کرشن کی شخصیت بڑی داغدار دکھائی دیتی ہے۔ بالخصوص گوالنوں سے چھیڑ چھاڑ کے قصے اور عشق و مستی کی وارداتیں بعض شعراء نے اس انداز میں پیش کی ہیں کہ ان میں عقیدت سے زیادہ تلذذ جنسی کی کیفیات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ لیکن سنت مہاتماؤں نے ایسے عشق مجازی کو زینۂ عشق حقیقی کہہ کر استیلائے عشق و محبت کو روا رکھنے میں

[1] صفی بندرابنی: مضمون دقیق، مشمولۂ رسالہ "اوم" دہلی ۱۹۵۵ء، ص ۴۴

کوئی قباحت محسوس نہیں کی بلکہ اس کی افادیت و اہمیت میں مبالغہ آرائی سے کام لے کر دیوی۔ دیوتاؤں سے اس کا رشتہ جوڑا اور "سلوک الی اللہ" میں اسے ایک منزل گردانا ہے۔ صفی نے مذکورہ نظم میں کرشن کو یاد کرکے ان کے بھکتوں کو عشق کی اہمیت بتلائی ہے اور یہ تلقین کی ہے کہ "اگر کرشن ہی تیری نیاز ہے، تیرا مقصود ہے تو عشق کی زنجیر کا حلقہ بن جا اور "خاک کوئے عاشقاں" سر پر ڈال کہ یہی منزل مقصود پر پہنچنے کا راستہ ہے۔ صفی اس بات سے بھی خبردار کرتے ہیں کہ رہ عشق میں قدم رکھنا معمولی کام نہیں اور نہ یہ ہر ایک کے بس کا کام ہے اس لیے دن رات اس معشوق حقیقی (کرشن) کے ذکر سے اپنے دل و زبان کو تر و تازہ رکھ اور اس کا تصور کرتا رہ کہ اسی میں نجات ہے۔ صفی "نام کرشن" میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ذکر کن شام و سحر تو ذکر کن — تو ہمیں ہر لحظہ، ہر دم فکر کن
ورد کن نام مبارک صبح و شام — تا بباشی اے صفی تو شاد کام[1]

کرشن کی گوکل کی زندگی بڑی عجیب تھی۔ جنگل میں گائیں چرانا، جمنا کے کنارے شور و شغب اور اودھم مچانا ساتھ ہی دلفریب دھن میں بانسری بجانا ان کا معمول تھا کرشن بھکتوں کو 'بال کرشن' کا یہ روپ بھی موہ لیتا ہے، ان کے تصور سے بھکتوں کو سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے تو شاعر کہتا ہے۔

کرشن ے نماید بوالعجب — پر تلطف گاہ باشد پر غضب
کودکے، از حد جمیل و نیل فام — بر لب آب جمن محو خرام
گاہ رقصاں نے نوازی می کند — گاہ با یاران بازی می کند

[1] "ادم" دہلی جولائی ۱۹۵۹ء ص ۳۲۔

خوش خرامے دلربائے ساحرے — آں کریم بے مثال ہم قاہرے
آں بکند ور در نام پاک او — دور گرد و بیم او، ہر باک او
خواہش قربش بداری گر صفی
کن خیال خویشتن یکسر نفی[1]

کرشن کی محبوبہ رادھا اگرچہ دیویوں کے زمرے میں نہیں آتی، پھر بھی کرشن مندروں میں کرشن کے ساتھ رادھا کی مورتی بھی رکھی جاتی ہے اور اس کی پوجا کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسی کے پیش نظر جگن ناتھ کھنہ نے اپنی نظم "پیغام کرشن" میں کرشن کے ساتھ رادھا کی بھی توصیف کی ہے۔ ستائش کا یہ انداز اگرچہ ستائش معشوق سا ہے لیکن نظم کے آخر میں کرشن کی زبان ہی سے کہدیا گیا ہے کہ رادھا کی یاد میں بھگت (سالک) کا محو رہنا قربِ کرشن ہی نہیں حصولِ کرشن کا ذریعہ ہے۔

شاعر رادھا کا سراپا بیان کرتا ہے کہ ایک دن میں جمنا کے کنارے محو خرام تھا تو اچانک مجھے بانسری کی دھن سنائی دی۔ جس کے سننے میں میرا استغراق بڑھتا گیا اور میں مدہوش و بے خود ہو کر ریت میں گر پڑا۔ ہوش آنے پر میں نے جب آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ ے

چشم وا کردم چوں دیدم مہرنے — گل اندامے، شوخ چشمے، گل رخے
آں پری پیکر ہمہ تن نور بود — ایستادہ از حقیرم دور بود
شوخ چوں بر من نظر انداختہ — سر بسر مسحور و بیخود ساختہ
منظر دلکش عجب پیدا شدہ — جانِ من بر شوخ آں شیدا شدہ

[1] "ادم" دہلی ستمبر ۱۹۵۷ء ص ۹۔

سر بسر گشتم فدائے روئے او — ہم چناں محو ضیائے روئے او
سوئے من دیدہ بخندید آں حسین — در دلم تبدیلئے آمد ازیں

اس شوخ رو حسینہ کے متعلق شاعر کرشن کی زبان سے کہلواتا ہے ؎

من فرستادم بجوایں مہ لقا — ہمہ تن حُسنم و نورم، سرتا پا
مے درخشند کہکشاں از نور ایں — مہر و ماہ تابندہ گردند از ہمیں
من مبارکباد را ہیہ کنیم — از کرم پیشِ تو داں اے عاشقیم
یافتی دیدار را از ما سر بسر — تا کنی یادش صفتی شام و سحر
عاشقاں یابند ایں دیدار را — خوب فہمند آں ایں اسرار را
ہر کہ را [illegible] را تصور می کند — حجرۂ دل را منور می کند[1]

ان چند مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ آزادی کے بعد بھی رجحان اردو کے لالے پڑے ہوئے تھے تو فارسی کی کیا بساط) فارسی کے چاہنے والوں نے اپنے دیوتاؤں کی توصیف و تعریف کے لیے اس کلاسیکل زبان کو اپنایا اور نہایت اخلاص سے دیوتاؤں کے ساتھ ہی اس زبان کی بھکتی کو اپنا شعارِ حیات بنا لیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنی شیرینی اور اثر آفرینی کی بدولت زندہ رہنے والی زبان کو تعصب کی آگ اور آندھیاں مٹا کر خاکستر نہیں کر سکتیں اور کرخت و بے اثر زبان کو لاکھ سنوارنے، بڑھانے، ترقی دینے کی کوششیں کی جائیں وہ بار آور نہیں ہو سکتی۔ کاش برادرانِ وطن لسانی تعصب کو بالائے طاق رکھ کر ہر زبان کی ترقی کے لیے راہ ہموار کرنے کی سعی کرتے رہیں تو امن کا گلشن کھل اٹھے گا۔

---

[1] رسالہ "اوم" دہلی ستمبر ۱۹۶۸ء ص ۲۱-۲۲۔

اخبارِ علمیہ

تفسیر، حدیث و فقہ ہی نہیں جملہ علوم اسلامیہ میں ممتاز امام اور تقریباً چھ سو کتابوں کے مصنف و مولف امام جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطی کا انتقال پانچ سو برس پہلے ۹۱۱ھ میں ہوا تھا، ان پانچ صدیوں سے ان کا فیضان جاری ہے، اب دمشق کی المجمع العلمی کے مجلہ سے معلوم ہوا کہ وہاں کے علمی اداروں نے اس موقع پر یادگار تقریبات کا اہتمام کیا، خود مجلہ نے امام سیوطی کے متعلق اپنا ایک عمدہ و بلند پایہ خاص شمارہ شایع کیا، وہاں کے اہلِ علم کی یہ خواہش بھی اب پوری ہوتی نظر آتی ہے کہ امام صاحب کی جو کتابیں مخطوطہ ہیں ان کی اشاعت اور مطبوعہ تصانیف کے طبع جدید کے لیے ایک خاص ادارہ قائم کیا جائے مجلہ کے ایک مضمون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام سیوطی کے ایک شاگرد عبدالقادر شاذلی نے اپنے استاد کے سوانح "بہجۃ العابدین بترجمۃ حافظ العصر جلال الدین" کے نام سے مرتب کیے تھے، اب اس مخطوطہ کے زیورِ طبع سے آراستہ ہونے کا وقت بھی آ گیا ہے۔

گذشتہ دنوں فرینکفرٹ جرمنی میں کتابوں کا پینتالیسواں عالمی میلہ ہوا، اس میں چھیانوے (۹۶) ملکوں کے آٹھ ہزار چار سو تین (۸۴۰۳) ناشرین کتب نے شرکت کی، اس مرتبہ شائقین کے علاوہ نئے مضامین کی کمی بھی خاص طور پر محسوس کی گئی، تاہم ناشرین کی نظر میں تجارتی اعتبار سے یہ میلہ کامیاب ہی رہا، ۱۹۹۲ء میں اسی فرینکفرٹ کے میلہ کا خاص موضوع جنسیات تھا، اس سال ناولوں کی گرم بازاری رہی، تین کتابیں [illegible] اور

گفتگو کا مرکز رہیں' ان میں ایک برطانیہ کی سابق وزیر اعظم مسز مارگریٹ تھیچر کی کتاب 'دی ڈاوننگ اسٹریٹ یرس' ہے۔ دو لاکھ کی تعداد میں چھپنے والی کتاب اس لیے بھی موضوع بحث رہی کہ ناشر نے انتہائی رازداری اور شب و روز کے پہرہ کے ساتھ اسکی اشاعت کا اہتمام کیا اور بازار میں جانے سے پہلے اس کے اولین چار نسخوں میں ایک مارگریٹ تھیچر کو' دوسرا سنڈے ٹائمز کو اور بقیہ دو پبلشر کو ملے تھے، لیکن اس کے باوجود جب برطانیہ کے ایک اہم اخبار ڈیلی مرر نے اس کے مسودہ کے بعض حصوں کو شایع کرکے اور چند اور ابواب کو چھاپنے کا اعلان بھی کر دیا تو یہ قضیہ جب عدالت میں پہنچا تو اس نے بھی پابندی عائد کرنے سے انکار کر دیا، دوسری کتاب جو سب سے زیادہ موضوع گفتگو رہی وہ کسی گمنام کے ناول 'گرلس' کا مسودہ تھا، اس کے حقوق اشاعت خریدنے والوں میں شدید مسابقت کا جذبہ دیکھنے میں آیا، بڑی کرید کے بعد پتہ لگا کہ یہ ایک نہایت مشہور اداکار کی قلمی کاوش کا ثمرہ ہے، تیسری کتاب برطانیہ کے شاہی خاندان کے مقبول صحافی آرتھر ایڈورڈ کی I WILL TELL THE JOKES ARTHUR : DIANA, THE ROYAL FAMILY AND ME تھی' اس میں شاہی خاندان خصوصاً شہزادی ڈیانا کی ذاتی زندگی کے احوال و اسرار کی پردہ کشائی کی گئی ہے، اس میلہ کی مقبول ترین کتابوں میں خلیجی جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا ناول THE FIST OF GOD بھی ہے، دی ڈے آف دی جیکال اور دی ڈاگس آف وار جیسی کلاسیکل تحیر انگیز کہانیوں کے لکھنے والے فریڈرک فورسِتھ کے اس ناول کو بھی سب سے زیادہ جذباتی اور موثر کاوش قرار دیا گیا۔

ویدک ادب خصوصاً رگ وید کی قدامت اور اس کا زمانۂ تالیف محققین کا پرانا دلچسپ موضوع ہے، یوروپی محققین کا عام خیال ہے کہ ہندوستان آنے کے بعد آریوں نے مناجاتوں

کا یہ مجموعہ پندرہ سو سال قبل مسیح میں مرتب کیا تھا، آریائی خانہ بدوش بعض مظاہر قدرت مثلاً ہوا، آگ اور برسات سے ان مناجاتوں میں مدد کی درخواست کرتے تھے تاکہ انکی پیداوار اور بہتر ہو اور ہندوستان کے اصل باشندوں سے جنگ و مقابلہ میں ان کی فتح ہو' اب محققین نے ان دعاؤں میں فلکیات و نجوم کے اشاروں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان سے رگ وید کی اعلیٰ درجہ کی سائنسی روشن خیالی ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ویدک ادب کا عہد دس ہزار سال قبل مسیح کا ہو سکتا ہے اور یہ ایک بہتر تعلیم یافتہ طبقہ اور ایسے خاندانی زمینداروں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو فلکیاتی جزئیات کے ماہر تھے، اس خیال کی تائید حال ہی میں ترکی کے علاقہ نیوالی کوری کی وادی میں کھدائی سے برآمد ہونے والے ان آثار سے ہوتی ہے جو صاف طور پر ترقی یافتہ زمیندارانہ ویدی تہذیب کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں، ان کا زمانہ سات ہزار سال قبل مسیح بتایا جاتا ہے' اس حیرت ناک دریافت نے اس پرانے مفروضہ کو رد کر دیا ہے کہ اس عہد میں زمین اپنے برفیلے عہد کے اواخر سے گذر رہی تھی اور اس وقت تک کسی باضابطہ تمدن کا وجود نہیں تھا، اس وادی میں بے عیب شہری ترتیب و سلیقہ کے علاوہ اینٹ' پتھر اور گچ کا استعمال اور کئی بڑے پتھروں کی تعمیرات کے آثار بھی ملے ہیں جن میں ایک مندر بھی شامل ہے' اس کے علاوہ ایک چونے کے پتھر والی مورتی بھی ملی ہے جس سے یہاں ویدی اثرات کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ کے علاوہ قرون وسطیٰ کی ہندی تاریخ کے مطالعہ اور تجزیہ کی کوششیں بھی تیز تر ہیں، اس سلسلہ کی بعض اہم کتابوں کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں' ایسی ہی ایک کتاب 'کاسٹ' ریلیجن اینڈ کنٹری' اے ویو آف انیشنٹ اینڈ میڈیول

انڈیا' کا ذکر ہندوستان ٹائمز کے کتابوں کے کالم میں نظر سے گزرا، ایس' وی ڈیسی کاچر S.V. DESIKACHAR کی اس کتاب میں بقول مبصر ہندو مذہب' ذات پات، اسلام اور انگریزوں کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے، مصنف نے لکھا ہے کہ ہندویت کی اصلاح بہت بعد کی ہے یہ ہندوستان کے مزاج میں ڈھلی بعض رسوم کے مجموعہ کا نام ہے کیونکہ ہندویت میں نہ کوئی ایک ہادی ومعلم ہے نہ کوئی ایک ایسا عقیدہ' نقطۂ نظر یا جامع اصول ہے جس میں ہندویت کا ارتکاز ہو' مصنف نے بقول ہندوستان ٹائمز "بجا طور پر مسلمان حکمراں طبقہ یا مسلم دور حکومت کو غیر ملکی سمجھنے کو درست نہیں قرار دیا ہے"۔ ان کی نظر میں "عام آدمی کے لیے یہ محض اقتدار کی منتقلی کا عمل تھا" اور قوم پرستی کا جو مفہوم آج ہے' شروع کے دور میں اس کا وجود نہیں تھا لیکن وہ دوسری جانب اس مفروضہ کے بھی قائل ہیں کہ ہندوؤں میں ویدک عہد سے وحدت و یک جہتی کا احساس شمال سے جنوب تک رہا، ان کی دنیا میں کسی جدا مذہب اور معاشرہ کا تصور نہیں تھا، آغاز میں حملہ آور اور مہاجرین اس سماج میں ضم ہوتے گئے'، اس صورتحال کو مسلمانوں کی آمد نے بدلا، مسلمان غیر ملکی تو نہیں کہے جاسکتے لیکن ان کی حکومت ایک خاص نسل کے اقتدار کی نمائندہ تھی، اس کا موازنہ آج جنوبی افریقہ کی سفید فام حکومت کی قوت و غلبہ سے کیا جاسکتا ہے" تضاد بیانی کے باوجود مصنف نے بعض مفید نتائج بھی پیش کیے ہیں مثلاً قدیم ترین زمانہ سے اختلافات کے باوجود ایک ہندوستان کا تصور صرف نظریہ ہی نہیں ایک مقصد بھی تھا لیکن مسلمانوں کی آمد تک کوئی بامقصد اہم اور نتیجہ خیز تحریک سامنے نہیں آئی تھی، اسلام کی آمد نے اس مقصد کو پورا کر دیا۔

(ع۔ ص)

معارف کی ڈاک

شعبہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ لاہور

۲۶ اکتوبر ۱۹۹۳ء

(۱)

مخدوم گرامی قدر جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب!

السلام علیکم۔ پرسوں آپ کا خط ملا تھا۔ حسب الحکم اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی پانچ جلدیں (۱۸ و ۲۰ تا ۲۳) بذریعہ رجسٹرڈ بک پیکٹ تین علحدہ پیکٹوں میں روانہ خدمت ہیں۔ جلد نمبر ۱۹ ختم ہے' دیکھئے دوبارہ کب چھپتی ہے۔ بھیجنے میں دیر کی کچھ وجہ الیکشن کا جھمیلہ اور پھر میری بیماری تھی۔ جلدیں ملنے پر اطلاع دیں۔

دیگر مضامین کے علاوہ جلد نمبر ۲۰ و نمبر ۲۱، میرے دو مقالات (مدارس اور مصر) قابل ملاحظہ ہیں۔ مدارس (جلد نمبر ۲۰) ص ۱۶۱ تا ۱۹۴ میں' میں نے تمام عالم اسلام کے عربی مدارس کا ذکر کیا ہے اور ہندوستان کے مدارس کے ضمن میں مدرسۃ الاصلاح کا بھی ذکر خیر ہے، مصر (جلد نمبر ۲۱) ص ۱۸۶ تا ۲۲۶ میں مصر کے سیاسی حالات کے علاوہ وہاں کی علمی' ادبی تاریخ بھی لکھ دی ہے جو آپ کے لیے خاص طور پر دلچسپی کا موجب ہوگی ایک تکملہ کی ترتیب بھی زیر نظر ہے' اس میں مولانا حمید الدین فراہیؒ اور دوسرے ہندوستانی مشاہیر کا ذکر ہوگا۔

فقط والسلام نیاز مند

(شیخ) نذیر حسین

(۲)

شعبہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۷/۱۱/۹۳ء

محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے، مرسلہ خط بذریعہ ڈاک موصول ہوا، شاہ ولی اللہؒ کے مقدمہ فتح الرحمٰنؒ کے سلسلہ میں مزید استفسارات کے جواب میں عرض ہے کہ اس کے علیحدہ کتابی صورت میں اشاعت کی اطلاع مجھے ایک صاحب کی زبانی ملی تھی لیکن تلاش بسیار کے باوجود نہ تو یہ مطبوعہ نسخہ یہاں دستیاب ہو سکا اور نہ کسی کتاب یا کتابیات میں اس کی اشاعت کا ذکر مل سکا۔

ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں "مقدمہ فی قوانین الترجمہ" کا جو مخطوط محفوظ ہے۔ اس کی فوٹو کاپی ادارہ علوم القرآن (سر سید نگر، علی گڑھ) کی لائبریری میں موجود ہے۔ میں نے اس کا مقابلہ برہان اکتوبر و نومبر ۱۹۴۵ء میں شایع شدہ مقدمہ ترجمۃ القرآن (مع اردو ترجمہ) کے متن سے کیا تو یہ یقین ہو گیا کہ دونوں ایک ہی ہیں، برہان میں بھی اندر متن میں اس کا نام "مقدمہ فی قوانین الترجمہ" دیا ہوا ہے، البتہ دونوں کے متن میں

۱؎ شاہ صاحبؒ نے فارسی زبان میں قرآن مجید کا جو ترجمہ کیا تھا اس کا ایک مقدمہ بھی لکھا تھا جو ترجمہ کے ساتھ چھپتا رہا ہے اور جیسا کہ مکتوب نگار نے لکھا ہے یہ علیحدہ بھی شایع ہوا ہے، اس کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے ایک رسالہ مقدمہ فی قوانین الترجمہ بھی لکھا تھا، مجھے اشتباہ ہو گیا تھا کہ یہ اور مقدمہ ترجمہ ایک ہی چیز ہے، لیکن اس خط سے پہلے ہی اشتباہ دور ہو چکا تھا، قوانین الترجمہ کا اردو ترجمہ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم سابق ناظم جمعیۃ علمائے ہند کے قلم سے برہان میں چھپا تھا۔ دونوں مقدمات کا موضوع ایک ہے لیکن مشمولات جدا ہیں۔ (ض)

کہیں کہیں الفاظ کا فرق ملتا ہے جسے نسخوں کا اختلاف یا نقل کرنے والوں کی مسامحت یا بعض لفظوں کو صحیح نہ پڑھنے کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے۔

جب میں نے ان دونوں کا مقابلہ شاہ صاحب کے فارسی ترجمہ قرآن "فتح الرحمٰن" کے ساتھ شایع شدہ مقدمہ سے کیا تو یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ یہ مقدمہ اور مذکورہ مقدمہ فی قوانین الترجمہ دونوں دو چیزیں ہیں، دونوں کے مواد میں کافی فرق پایا جاتا ہے، ترجمہ کے شایع شدہ مقدمہ میں ترجمہ کے فن واصول پر انھوں نے مختصر روشنی ڈالی ہے، اور خاص طور سے اپنے فارسی ترجمہ کا پس منظر اور اس کی خصوصیات بیان کی ہیں، اس وقت میرے پیش نظر تاج کمپنی، لمیٹڈ، لاہور سے ۱۹۸۶ء میں شایع شدہ فتح الرحمٰن کا نسخہ ہے۔

مجھے توقع ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے فارسی ترجمہ کے اس مقدمہ پر نئے سرے سے کچھ لکھتے وقت ششماہی علوم القرآن کو ضرور یاد رکھیں گے، اس طرح یہ اس مجلہ کے جنوری۔جون ۹۲ء کے شمارے میں شایع شدہ آپ کے مضمون "مقدمہ فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن کا تجزیاتی مطالعہ" کا تکملہ ہو جائے گا۔

عہد وسطیٰ کے ہندوستان یا مسلم دور حکومت کی تاریخ کا ایک طالب علم ہونے کی وجہ سے اکتوبر ۹۳ء کے معارف میں اخبار علمیہ کا کالم میرے لیے دلچسپی کا باعث بنا، برادر مکرم جناب عمیر الصدیق صاحب نے بڑے اچھے انداز و موثر اسلوب میں اس زمانہ کی تاریخ کے کچھ اہم موضوعات پر انگریزی کی بعض نئی کتابوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں، موجودہ صورتحال میں جب کہ اس عہد کی تاریخ مسخ کر کے مسلمانوں کے خلاف نفرت وعداوت کے جذبات بھڑکانے کی مہم زور وشور سے جاری ہے، ایسی کتابیں یا تحریریں یقیناً قابل قدر ولائق تحسین ہیں جو غیر جانبدارانہ مطالعہ تاریخ اور

مذہبی یا فرقہ وارانہ نقطۂ نظر کے بجائے خالص سیکولر انداز اور سیاسی و انتظامی ضروریات کی روشنی میں تاریخی واقعات کے تجزیہ پر مشتمل ہوں، اس میں شبہہ نہیں کہ یہ ترقی پسند مورخین و اہل قلم اپنی زبردست علمی و تحقیقی خدمت سے زہر آلود تحریروں کے اثرات کم کرنے میں مدد معاون بنتے ہیں جس کے لیے ان کی تائید و حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے لیکن ان کی کتابوں یا ان کی تاریخ نگاری کے منہج کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا اور وہ یہ کہ یہ مورخین اس عہد کی تاریخ سے مذہب یا مذہبی تقاضوں کے عمل دخل کو یکسر خارج از امکان قرار دیتے ہیں اور تاریخی واقعات یا حکمرانوں کے جملہ اقدامات کی سیاسی و انتظامی یا معاشی توجیہ پیش کرتے ہیں، ان کی کتابیں پڑھ کر یہ تاثر ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مسلم حکمرانوں کو مذہب و مذہبی امور سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اگر کسی کو تھی بھی تو اس پر سیاسی یا وقتی مصلحت غالب تھی، ان حکمرانوں سے شعوری یا غیر شعوری طور پر نہ دین کی کوئی خدمت انجام پائی اور نہ ہی ان کے کسی سیاسی عمل یا انتظامی اقدام میں دینی جذبہ یا شریعت کی پابندی کا خیال کارفرما تھا۔

گو اس عہد میں نظام حکومت بادشاہی تھا جس میں تیموری و ایرانی اصول جہانبانی کے اثرات بھی پائے جاتے تھے نیز اس وقت کے مسلم حکمرانوں کے سیاسی، آئینی یا انتظامی اقدامات تمام تر اسلام کے اصولِ حکمرانی اور شریعت کے ضوابط کے مطابق نہ تھے تاہم اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ وہ مذہب اور اس کے تقاضوں سے قطعاً بے تعلق تھے اور ان کی حکومت کے اقدامات میں خالصتہً سیاسی یا معاشی عوامل ہی کارفرما رہے ہیں اور ایک حکمراں کی حیثیت سے ان کے کسی عمل میں بھی دین و شریعت کی پاسداری کا جذبہ کارفرما نہیں رہا، میرے خیال میں ان حکمرانوں کے خلافِ شریعت انتظامی ضوابط و اقدامات کی وضاحت

کردینے اور انہیں غلط قرار دینے میں کسی تکلف سے کام نہیں لینا چاہیے لیکن انکے جس عمل میں کسی مذہبی تقاضے کی تکمیل یا شریعت کے کسی قانون کی پابندی واضح طور پر نظر آتی ہو انہیں نظر انداز کردینا یا انکی کوئی اور تعبیر پیش کرنا حقائق کی غلط ترجمانی کے مترادف ہوگا اسکی ایک واضح مثال جزیہ ہے جس کے بارے میں بعض مورخین کی یہ رائے ہے کہ اورنگزیب یا بعض دوسرے مسلم حکمرانوں کے عہد میں سیاسی تقاضوں یا معاشی ضرورتوں کے تحت اسکا نفاذ عمل میں آیا حالانکہ اس قسم کی کسی تاویل یا توجیہ کے بجائے اسے شریعت کے ایک قانون کا نفاذ تسلیم کیا جانا بہتر اور مناسب ہوگا ضرورت ہے کہ اس قانون کی اصل غرض و غایت واضح کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ شریعت کے مطابق اسکے نفاذ کے بعد مسلم حکومت میں ایک غیر مسلم شہری کو کیا حقوق و مراعات حاصل ہوتے ہیں اور کس طرح اس سے سماجی و معاشی تحفظ فراہم ہوتا ہے۔

مزید براں اگر اس عہد کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس دور میں جو سیاسی اصول و ضوابط جاری ہوئے اور نظم و نسق کے جو شعبے قائم ہوئے وہ کافی حد تک مرکزی ایشیا کی مسلم حکومتوں سے مستعار تھے۔ دیوان خراج، قضا، احتساب، افتاء وغیرہ کے شعبے اور نظم و نسق کے دائرہ بالخصوص شعبۂ مالیات میں زکوٰۃ، خراج، جزیہ، عشور، عشری و خراجی مزارعت و مضاربت، بیت المال وغیرہ جیسی اصطلاحات ایشیا و افریقہ کے مختلف علاقوں میں پہلے کی مسلم حکومتوں میں مروج تھیں، اسی عہد کی تاریخ کے ضمن میں یہ بات بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ دیگر علوم و فنون کے علاوہ تفسیر، حدیث و فقہ کے میدان میں اس زمانہ میں ایسی نمایاں خدمات انجام پائیں کہ انکے نقوش آج بھی زندہ و تابندہ ہیں ان خدمات میں اہل علم و فن کی اپنی دلچسپیوں و کوششوں کے علاوہ سلاطین و امراء کی معارف پروری اور علمی سرپرستی کا بھی معتدبہ حصہ رہا ہے، ان سب کے علاوہ اس عہد سے متعلق ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر اس پہلو کو بھی نمایاں کرنے کی ضرورت ہے کہ ان حکمرانوں نے اس زمانہ کے مزاج و حالات کے

مطابق سیاسی وانتظامی، سماجی واقتصادی، علمی وتمدنی ہر میدان میں جو نمایاں خدمات انجام دیں وہ اس ملک کی تعمیر وترقی کیلئے بہت مفید ثابت ہوئیں، اس طرح عہد وسطیٰ کا ہندوستان نہ صرف مسلمانوں کی سیاسی وثقافتی تاریخ کا ایک اہم باب ہے بلکہ اس ملک کی سیاسی وسماجی اور علمی وتمدنی تاریخ کا بھی ایک نمایاں ورق ہے، برادرم عمیر صاحب کی خدمت میں میرا سلام عرض کریں گے، محترم اشتیاق بھائی اور پروفیسر یٰسین مظہر صاحب کی جانب سے سلام قبول فرمائیں۔

والسلام ظفرالاسلام اصلاحی

(۳)

وجیا نگر کالونی۔ حیدرآباد ۴ ر نومبر ۱۹۹۳ء

مکرم ومحترم۔ سلام مسنون

جناب ڈاکٹر حامد اللہ ندوی بمبئی کے ایک ممتاز لائبریرین اور اردو کے لائق محقق ہیں انکا ایک مقالہ "احوال قادر ولی عرف شاہ میراں" فروری تا اپریل ۱۹۹۱ء کے معارف میں شائع ہوا تھا اسمیں موصوف نے اردو کی ایک قدیم مثنوی کا تعارف کرایا تھا انکے پیش نظر مثنوی کا جو نسخہ تھا اسکے آخری صفحات غائب تھے اتفاق سے انہی دنوں مثنوی کے مصنف کے بارے میں کچھ تفصیلات میری نظر سے گذریں جنکو میں نے معارف میں اشاعت کیلئے بھیجدیا۔ چند ہفتے قبل محترم ومکرم اکبرالدین صدیقی صاحب کی بیگم صاحبہ نے بڑی محنت سے میرا پتہ معلوم کرکے اطلاع دی کہ بمبئی کے ڈاکٹر حامد اللہ ندوی صاحب نے میرے لیے صدیقی صاحب کے پاس ایک کتاب روانہ کی ہے میرے لیے کتاب کے تحفہ کی اطلاع ایک خوشخبری تھی، چنانچہ میں فوراً ہی اسے لینے کیلئے صدیقی صاحب کے یہاں پہنچ گئی، میرے تعجب اور خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے ایک بڑے محقق کی کتاب "اردو کی چند نایاب مثنویاں" میں اپنا وہ مضمون دیکھا جو قادر ولی کے بارے میں معارف میں شائع ہوا تھا۔ ندوی صاحب چاہتے تو میری فراہم کردہ معلومات کو بلا حوالہ یا حوالہ کیساتھ اپنے مضمون اور کتاب میں شامل کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے یہ مکمل مضمون میرے نام ہی سے اپنی کتاب میں شامل کر دیا، ایسی ادبی دیانت داری کی مثال اب بہت کم ملے گی، ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں جناب اکبرالدین صاحب صدیقی کا ایک خط بھی شامل کیا ہے جو اس مثنوی کے نام اور مصنف کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ میں نے اس ضمن میں جناب ندوی صاحب کو جب شکریہ کا خط لکھا تو انھوں نے فوراً یہ جواب عنایت فرمایا جو انکے عالمانہ انکسار کی مثال ہے:

"میں نے آپکا مقالہ کو اپنے مضمون میں شامل کرکے دراصل اپنے مضمون کی کمی کو پورا کیا ہے، آپ پر احسان نہیں کیا کیونکہ وہ معلوماتی تھا۔ میرے ہوا نظار شکر کو معارف میں جگہ مل جائے تو ادبی دیانتداری کی یہ مثال اسکے صفحات میں محفوظ ہو جائے گی۔ شاکرہ۔

مطبوعات جدیدہ

اشراف عرب از جناب سید محمد نجم الحسن، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۷۲۰، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: جاجنیری اکیڈمی آستانۂ سادات سانحہ، ۱۰۸۱ سی جہانگیر روڈ غربی، کراچی ۷۴۸۰۰۔

علم انساب اور شجرۂ انساب کے حفظ و ورد کا شوق دلچسپ اور مفید ہونے کے باوجود پہلے کی طرح اب زیادہ اہم نہیں رہ گیا ہے لیکن تاریخ اقوام اور تذکرہ وسوانح کے ضمن میں اس سے صرف نظر آج بھی ممکن نہیں ہے، زیر نظر کتاب اسی علم قدیم کی جدید کڑی ہے جس میں حضرت آدمؑ سے دور حاضر تک کے بعض خاندانوں کی کڑیاں مرتب کی گئی ہیں، کتاب کے تعارف میں سید مصباح الدین دسنوی نے لکھا ہے کہ "مرتب کا یہ کارنامہ دنیا کے تمام خاندانوں پر محیط ہے" یہ اس حد تک درست ہے کہ اس میں حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک ایک معروف شجرہ نقل کیا گیا ہے، ورنہ کتاب کا اکثر حصہ ہندوستان کے سادات وشیوخ اور بعض ترک و افغان خاندانوں کے شجرۂ نسب پر مشتمل ہے اور اس میں بھی زیادہ حصہ سرزمین بہار کے خانوادوں کے لیے خاص ہے، فاضل مولف کا تعلق بھی سانحہ مونگیر کے جاجنیری سادات سے ہے اس لیے طبعاً اس خطے کے خاندانی شجروں کے متعلق انکا دائرۂ معلومات زیادہ وسیع ہے، اسلاف کا ذکر عموماً فخر ومباہات سے خالی نہیں ہوتا اسکا اثر غیر شعوری طور پر ہی سہی ظاہر ہوکر رہتا ہے خوشی ہے کہ فاضل مولف نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے شروع میں صاف لکھ دیا کہ "اگرچہ خاندانی اعزاز اور شرافت انسانی ایک طرۂ امتیاز ہے مگر فخر ومباہات فرومایہ کے سرمایہ ہیں، فضیلت کا معیار تو تقویٰ

کی اقدار پر ہے"۔ کتاب میں محض شجروں کے شمار و بیان پر اکتفا نہیں ہے بلکہ اہم شخصیتوں کا مختصر لیکن جامع تعارف بھی ہے اور اس سے گویا ہندوستان خصوصاً عہد اسلامی کی تاریخ کی ایک جھلک بھی سامنے آجاتی ہے اور بعض دلچسپ معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں مثلاً بہار کے شیوخ میں ۱۱۸۰ء کے حضرت مومن عارف صوفی یمنی کے ذکر میں لکھا گیا ہے کہ یہ عربی النسل بزرگ منیر شریف تشریف لائے انکے گیارہ بیٹے تھے جنھوں نے پارچہ بافی کا پیشہ اختیار کیا ان کی اولاد بہار میں مومن انصار کہلاتی ہے، اسی طرح شاہ نعمت اللہ ولی کے تذکرہ میں انکی پیشینگوئیوں پر مشتمل مثنوی کے بعض دلچسپ اشعار نقل کیے گئے ہیں، سادات حسنی کے بیان میں پاکستان میں عراق کے سابق سفیر شیخ کمال الدین کو چشم و چراغ غوثیت اور سفیر دستگیر کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے لیکن تعجب ہے کہ انکا شجرہ تو در کنار انکے والد کے نام کا بھی ذکر نہیں۔ ایک جگہ سادات واسطی پر تبصرہ کرتے ہوئے انکی پشتوں کی مدت کا تعین بھی کم دلچسپ نہیں، مولف کے خیال میں دور جدید میں نسل انسانی ۲۵ سال کی سمجھی جاتی ہے دور قدیم میں اس کا اوسط ۳۶ سال کا تھا اس لیے انھوں نے ۲۵ اور ۳۶ کو جمع کرکے ۲ سے تقسیم کیا تو ۳۰ سال کا اوسط نکلا پھر ۱۴۱۰ھ کو ۳۰ سے تقسیم کیا تو خارج قسمت ۴۷ آیا اس طرح سن مذکور کی نسل حضرت علیؓ کی سینتالیسویں پشت قرار پائی، بعض تسامحات بھی ہیں جیسے خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی جائے پیدائش اودھ کے متعلق لکھا کہ اسے اجودھیا یا بارہ بنکی کہتے ہیں، حالانکہ یہ دو جگہیں ہیں جنکا فاصلہ خاصا ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ذکر میں انہوں نے سیرۃ النبیؐ کو چھ جلدوں پر مشتمل بتایا ہے حالانکہ اب یہ سات جلدوں میں ہوگئی ہے، بعض جگہ عوامی روایتوں کو قطعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، جیسے "سردار قائم خاں راجپوت تھے" یہ خانوادہ حضرت نوحؑ کے بیٹے سام کی اولاد ہے"، یا "حضرت طالوت افغان قوم کے مورث اعلیٰ تھے"۔ اشراف عرب کے ذکر میں بخت نصر، سکندر اعظم،

رستم و سہراب اور راجہ رام نرائن موزوں کی موجودگی کا کیا جواز ہے؟ کتابت و طباعت کی غلطیاں بھی ہیں لیکن کتاب کی ضخامت دیکھتے ہوئے یہ زیادہ نہیں ہیں۔

اسد اللہ خاں غالب مرد از جناب کالیداس رضا گپتا، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۸، قیمت ۸۰ روپے، پتہ: ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ، جولی بھون نمبر ۱۔ ۱۰ نیو مرین لائنز، بمبئی ۴۰۰۰۲۰۔

غالبیات سے جناب کالیداس رضا گپتا کے غیر معمولی شغف بلکہ عشق کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انکی فہرست مولفات میں تقریباً ۱۶ کا تعلق مرزا غالب سے ہے، زیر نظر مجموعہ مضامین بھی اس میں شامل ہے، ان میں غالبیات کے مختلف گوشوں مثلاً وفات غالب، بیدل، والی نوہارو اور تصانیف شیفتہ کے علاوہ مالک رام کی فسانہ غالب پر تبصرہ اور اولیات مالک رام کا تذکرہ بھی ہے، ایک مضمون میں حیات غالب کے نام سے شایع ہونے والی چند کتابوں کا تعارف دلچسپ ہے سید محمد مرزا موج کی حیات غالب کے متعلق کئی محققین کا خیال ہے کہ اس کا بڑا ماخذ آب حیات ہے لیکن فاضل مولف نے نواب شفیع خاں نیر فریدآبادی کے ایک مضمون کی نشاندہی کرکے دکھایا ہے کہ وہ بھی اس کتاب کا اہم ماخذ ہے اور بعض بعض عبارتیں تو ہو بہو نقل کر دی گئی ہیں ایک مضمون میں غالب کے بعض خطوط سے دکھایا ہے کہ غالب کو اپنے نام اور دیتہ کی شہرت کا کتنا خیال تھا اسکو مولف نے 'غالب کی انا کو کھل کھیلنے' سے تعبیر کیا ہے، ایک تحریر میں غالب، ناسخ اور اقبال کے غیر متداول کلام کی نشاندہی ہے اور ایک باب میں مولف کے قیام افریقہ کی یادوں میں غالب و اقبال کے اثر کا ذکر ہے، سخن فہم غالب کے شیدائیوں کے لیے یہ کتاب پرکشش ہے۔

دلوں کی خیر از جناب اکرام اللہ، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۶، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: اودھ بک سینٹر، ۹۶/۱۳۰ گنیش گنج لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱۔

اس کتاب کا موضوع دور جدید کی سائنسی ترقی اور خلاؤں و کائنات کے سربستہ رازوں

کی پردہ کشائی کے باوجود انسانیت کی شب تاریک کی ظلمتوں کا بیان ہے اور یہی شاید اس کتاب کے صوفیانہ عنوان کا محرک بھی ہے، لائق مولف نے ایک جانب ترقی یافتہ ملکوں کی اسلحہ سازی، مہلک ترین ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی، فوجی مصارف، نیوکلیائی اور کیمیاوی جنگوں کے خطرات بیان کیے ہیں تو دوسری جانب انہوں نے عالمی افلاس، جہالت پانی اور خوراک کی کمی اور دوا علاج کی ناکافی سہولتوں کا بڑی دردمندی سے جائزہ لیا ہے اردو میں اس قسم کی کتابیں کم ہیں، حالانکہ انکی ضرورت و اہمیت میں کلام نہیں، اس سے پہلے فرنگی تہذیب کے اخلاقی و معاشرتی پہلوؤں کا جائزہ لائق مولف نے "فریب تمدن" نامی کتاب میں لیا تھا، اسے خاصی پذیرائی حاصل ہوئی تھی، یہ کتاب بھی عالمی مسائل سے انکی باخبری کا نتیجہ ہے جو قبول عام کی بجا طور پر حقدار ہے۔

مولانا محمد سلمان خاں مرحوم نقوش و تاثرات مرتبہ جناب سلیم الرحمٰن ندوی و جناب کلیم الرحمٰن ندوی،

متوسط تقطیع عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۰۵، قیمت درج نہیں، پتہ:
مولوی عبید الرحمٰن ندوی، مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال، ایم۔ پی۔

مولانا محمد سلمان خاں ندوی مرحوم بھوپال کے ایک مستند مذہبی و علمی خانوادہ کے فرزند مولانا محمد عمران خاں ندوی کے برادر خورد اور بڑی خوبیوں کے مالک تھے کم سخن اور نام و نمود سے نفور کے باوجود مولانا کی صلاحیتیں خصوصاً انکی تنظیمی و تعمیری خوبیاں انکی عظمت و اولوالعزمی کی گویا تھیں ایشیا کی عظیم مسجد اور بھوپال کے لیے سرمایہ فخر و ناز تاج المساجد کے نامکمل خاکہ کی تکمیل اور اسکی تعمیر جدید میں بڑا عملی حصہ مولانا مرحوم کی شب و روز کی جانفشانی کا رہا، جسکا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنھوں نے تاج المساجد کی تعمیر میں انکی سرگرمیاں دیکھی ہیں انکی زندگی مرد مومن کی زندگی کا صحیح آئینہ تھی، انھوں نے اپنے تمام فرزندوں کو حفظ قرآن اور علم دین کی دولت سے مالا مال کیا انکی وفات کے بعد انکے لائق فرزندوں نے اپنے والد ماجد کی یادوں اور سبق آموز زندگی کو اس کتاب میں محفوظ کردیا تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی رہنمائی ملے۔

ع۔ ص۔